ادھورے خواب

انورزیب انور

کرن کرن روشنی پبلشرز
شاہین مارکیٹ ملتان 0301-7488695
kirnkirnroshni@yahoo.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:ادھورے خواب
مصنف	:انورزیب انور
سرورق وڈیزائننگ	:علی عمران ممتاز
قیمت	:400روپے
تعداد	:1000
اشاعت	:جنوری2023

نوٹ: کتاب کا کوئی بھی حصہ کرن کرن روشنی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جاسکتا۔

اچھی کتابیں ۔۔بہترین دوست

کرن کرن روشنی پبلشرز
ٹوائی لائٹ کمپیوٹرسٹڈیز 131۔حامد کمرشل سنٹر ممتاز آباد ملتان
موبائل: 0301-7488695
kirnkirnroshni@yahoo.com

انتساب

اپنی فیملی اور

اساتذہ کے نام

جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے

مجھے اس مقام تک پہنچایا

فہرست عنوانات

تعارف ---- 06

اُبھرتا ہوا ستارہ ---- نوید اقبال ستاری ---- 08

انورستان ---- سید محسن عباس گوہر ---- 11

انور زیب انور میری نظر میں ---- شارق عزیز میاں اعوان ---- 12

گلہائے انور ---- ساجد عباس ساجد ---- 14

ایک جھلک ---- 16

آخر کب تک؟ ---- 19

دلِ نامراد ---- 22

ایک دن کی کمائی ---- 23

ظالم سماج ---- 26

بے رحم والدین ---- 29

شہزادی بلقیس ---- 30

جھوٹ ---- 36

بھینس ہے ناں بھینس ---- 40

تیرے خوابوں پہ نچھاور ---- 42

گداگری اور خودداری ---- 44

مہر ماہ ---- 46

ادھورے خواب ---- 49

اٹل حقیقت ---- 52

الٹی گنگا ---- 53

محبت ---- 57

اداکاری ---- 60

جس کی لاٹھی اس کی بھینس ---------------------------- 63
کر بھلا ہو بھلا ---------------------------------- 66
آستین کے سانپ ------------------------------ 69
فرشتہ صفت لڑکی ----------------------------- 71
مطلب پرست -------------------------------- 74
سیزن --------------------------------------- 76
بری سنگت ---------------------------------- 79
تنہائی ------------------------------------- 82
وارننگ ------------------------------------ 84
پچھتاوا ------------------------------------ 87
میاں بیوی ---------------------------------- 89
خودکشی ----------------------------------- 92
بُرائی کا انجام ------------------------------- 95

سکون کے پیچھے بے سکونی --------------------- 98
محبّ اور محبوب ------------------------------ 100
مفلسی ------------------------------------ 103
جگنو اور انسان ------------------------------ 106
بے ضمیر ---------------------------------- 108
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا ----------------- 110
غریب کی عید ------------------------------ 113
اقوال زریں -------------------------------- 117

☆☆☆

تعارف

جہانزیب خان خٹک کے سپوت انور زیب خان خٹک ادبی دنیا میں انور زیب انور کے نام سے جانے والے ادبی دنیا کا ایک اُبھرتا ہوا ستارہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس، ناول نگار اور کہانی کار ہے۔ وہ 10 اپریل 1998 کو بروز جمعہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع نوشہرہ، نظام پور کے گاؤں آسوخیل محلہ نصرت خیل میں پیدا ہوئے۔ اُس نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول کاہی سے ایف ایس سی گورنمنٹ ڈگری کالج خان کوہی سے جبکہ عبدل ولی خان یونیورسٹی مردان سے ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کو شعروشاعری سے لگاؤ اوائل عمر سے تھا جبکہ نثر نگاری کے میدان میں بعد میں قدم رکھا۔ وہ معروف شاعر و افسانہ نگار نوید اقبال ستاری اور صفدر علی حیدری صاحب کو اپنا اُستاد مانتے ہیں اور انہی سے اصلاح لیتے ہے۔ انور زیب انور جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا نثر نگار کے طور پر بھی سامنے آیا ہے۔ اُس کے افسانے اگرچہ مختصر ہوتے ہیں مگر ان میں موجود کہانی اپنے اندر بھرپور جامعیت رکھتی ہے۔ انور زیب انور کا کلام بہت سے اخباروں، رسائل اور میگزینوں میں شامل اشاعت رہا ہے۔ اس کے علاوہ دس (10) انتخابی کتابوں میں جن میں چھ (06) شاعری مجموعے تین (03) افسانوی مجموعے جبکہ ایک (01) نعتوں پر مشتمل مجموعہ شامل ہے۔ ان دس (10) انتخابی کتابوں میں ان کا کلام خصوصی اور

اعزازیں طور پر شامل کیا گیا۔ انور زیب انور شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اُسے کئی اعزازوں اور اسناد سے بھی نوازا گیا۔ جن میں مشہور "فخرِ غزل گوئی، ملنے کے نہیں نایاب ہے ہم، بزمِ غالب ادبی انٹرنیشل اور ادب والے ہے" اور اسکے علاوہ انور زیب انور کو اُنکی بہترین ادبی کاوشوں اُنکی ادبی خدمات پر زمّرد سلطانہ فاؤنڈیشن نے سال 2022 کے ادبی ایورڈ سے بھی نوازا ہے۔

☆☆☆

اُبھرتا ہوا ستارا

افسانہ نگار معاشرے کا ایک ایسا حساس انسان ہوتا ہے جو اپنے اردگرد کے واقعات کو انتہائی گہری نظر سے دیکھتا اور اُس میں کہانی کھوجنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے افسانہ نگار کے اردگرد رہنے والے لوگ دراصل افسانہ نگار کے افسانوں کے کرداروں کی صورت میں اُسے نظر آتے ہیں۔ انور زیب انور ایک ایسا افسانہ نگار ہے، جو متوسط طبقے کا رہائشی ہے وہ اپنے اردگرد کے حالات و واقعات، لوگوں کی رہن سہن، ان کی مسائل پہ گہری نظر رکھتا ہے اور اپنے افسانوں میں انہیں اپنا موضوع بناتا ہے۔

انور زیب انور جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا نثر نگار کے طور پر بھی سامنے آیا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس، ناول نگار اور کہانی کار بھی ہے۔ اُس کے افسانے اگرچہ مختصر ہوتے ہیں مگر ان میں موجود کہانی اپنے اندر بھرپور جامعیت رکھتی ہے۔ چلیں میں اب انور زیب انور کے کچھ نثر پاروں کے بارے میں آپ سے بات کرتا ہوں۔ "ادھورے خواب" ایک ایسا افسانہ جس میں انور زیب انور معاشرے میں سرایت کر جانے والی بیماری رشوت، اور سفارش کو اپنا موضوع بناتے ہوئے بہت دلگداز انداز میں بتا رہا ہے کہ کس طرح مرکزی کردار جو کہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور بہت محنت اور لگن سے پڑھنے لکھنے اور پھر ڈگری حاصل

کرنے کے بعد جب گھر والوں کی اُمیدوں پر پورا اُترنے کا وقت آتا ہے تو ظالم سماج کے بے حس طبقہ یعنی رشوت خور افسران کی لالچ کی اس طرح بھینٹ چڑھ جاتا ہے کہ اس کا ٹیلنٹ ہونے کے باوجود اس کے بجائے دوسرے سفارشی اور مٹھی گرم کرنے والے لوگوں کو بھرتی کرلیا جاتا ہے اور وہ دل برداشتہ ہوکر نا اُمیدی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے اور بالآخر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملتا ہے۔جبکہ انور زیب انور کا کالم ”سیزن“ 14 اگست یومِ آزادی اور دوسرے اہم دنوں کے بارے میں ہے کہ جب ہمارے اندر پاکستانیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک انتہائی خوبصورت اقدام ہے جذبہ حب الوطنی ہونا چاہیے۔مگر متذکرہ کالم میں انور زیب انور نے لوگوں کے اس جز وقتی جذبہ پاکستانیت پر تنقید کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ محض ایک دن کے لیے ہی کیوں ایسے جذبات اُمڈ آتے ہیں،صرف دس محرم کو ہی کیوں پانی کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں یہ کام سارا سال کیوں نہیں ہوتا،قربانی کا جذبہ سارا سال کہاں چلا جاتا ہے،میلاد النبی ﷺ پر محض بارہ ربیع الاول کو ہی ہم سچے عاشقِ رسول بن جاتے ہیں اور یہ جھنڈیاں لگانا، یہ بیج لگانا، اور نعرے ،جلوس اور پھر اگلے ہی دن وہی بے ایمانی، وہی ناپ تول میں کمی، وہی بے حسی جو سارا سال چلتی ہے۔اور واقعی لمحہ فکریہ ہے کہ یہ تمام جذبات سارا سال کیوں نہیں رہتے؟ اچھی کہانی ہمیشہ اپنی وضع قطع بناوٹ، ساخت خوبی اور عمدگی کی بنا پر قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔

انور زیب انور جہاں معاشرے کے دیگر مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے وہیں وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی گہرا مشاہدہ رکھتا ہے اُس کا افسانہ ”ایک جھلک“ جس میں مرکزی کردار محض اس وجہ سے اپنی نماز ترک کر دیتا ہے یا پھر محض ٹکریں مار کر جلدی جلدی نماز پڑھ کر یعنی نماز کو بجائے خشوع وخضوع سے پڑھنے کے جلدی جلدی بُھگتا کر اپنے فضول مقصد کی جانب رواں ہوتا ہے اور جب وہاں سے ٹھوکر ملتی ہے تو تب اُس کو پچھتاوا ہوتا ہے کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنی نماز کو پورا کر لیتا تو اللہ خوش ہوتا اپنے فضول مقصد کی خاطر اُس نے خانخواہ اپنی نماز ترک کی۔

المختصر انور زیب انور کی نثر پر بات کرنے کے لیے جتنے بھی صفحات لکھے جائے وہ کم ہونگے۔وہ اُبھرتا ہوا نثر نگار، افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر ہے ابتدا اتنی خوبصورت اور جاندار ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف اپنی ادبی زندگی میں کافی ترقی کریں گے بہر حال نثر کے حوالے سے انکی یہ پہلی کتاب ”ادھورے خواب“ آپ کے ہاتھوں میں ہے پڑھیے اور مصنف کے فن کو داد دیجئے۔اللہ پاک اس نوجوان لکھاری کے کام میں مزید ترقی عطا فرمائے۔آمین

شاعر و ادیب

نوید اقبال ستاری

چیئرمین بزمِ ستاری مظفر گڑھ

انور زیب انور کہنہ مشق شاعر، اچھوتے تخیل کا مالک ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، کہانی نویس اور ڈھیروں اعزازات کا حامل نوجوان شاعر آپ اسے دیکھتے ہیں حیرت کا شکار ہو جائیں گے مگر جی جناب اس پر خاص کرم ہے خالق کا اور کیوں نہ ہو والدین کی دعا اور اپنی قوت پرواز پر بھروسہ جو ہے۔حالیہ کتاب ”ادھورے خواب“ کے افسانے پڑھنے کے بعد تو میں اس نوجوان کی صلاحیتوں کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔

کیا اٹھان ہے، کیا معاشرتی مسائل کا شعور و ادراک ہو اور کس خوبصورتی سے انھیں پیش کیا ہے موصوف معاشرتی رویوں اور احساس محرومی سے مارے لوگوں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے کالم، افسانے اور افسانچے پڑھنے کے بعد جہاں انور زیب کے معاشرتی شعور کا علم ہوتا ہے وہاں ایک قاری کو کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔کسی جگہ بے جا طوالت سامنے آتی ہے تو کسی جگہ جملوں کی بے ترتیبی، کہیں پر حالات وواقعات میں مماثلت کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔

بہت سے افسانوں میں نیا پن بھی ہے جیسے تیرے خوابوں پر نچھاور اور ایک دن کی کمائی۔المختصر اس ہیرے کو وقت کی دھار خود ہی کوہ نور بنا دے گی اور وہ وقت دور نہیں۔ والسلام

سید تحسین عباس گوہر (اوچ شریف)

بانی بزمِ سخن اوچ شریف، شاعر، افسانہ نگار و صداکار

انور زیب انور میری نظر میں

ادبی دنیا میں ”انور زیب انور“ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ بیک وقت بطور شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ادب کے اُفق پر ابھرتے ہوئے انور زیب انور اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ”ادھورے خواب“ ان کی پہلی کتاب ہے، جو کہ افسانوں، کہانیوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے کہ انور صاحب نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں ان کی کتاب پر تبصرہ کروں۔

جیسا کہ کتاب کا عنوان ”ادھورے خواب“ ہی اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ مصنف کے کچھ خواب ادھورے رہ گئے ہیں، جنہیں وہ حقیقت کا روپ دینا چاہتا ہے۔

بچہ جب ہوش سنبھالتا ہے تو اس کے اندر چھوٹی چھوٹی خواہشات جنم لینا شروع کر دیتی ہیں۔ جوں جوں وہ بڑا ہونے لگتا ہے، یہ خواہشات بھی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگتی ہیں۔ بقول غالب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انور زیب انور کے خواب کون سے ہیں۔۔۔؟ اس کتاب کی

چند تحاریر پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انور صاحب اپنے معاشرے کو بہت تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنے اردگرد کے حالات دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں اور مضامین میں جا بجا معاشرے کی ہی خرابیوں کا تذکرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے مسائل دیکھ کر وہ بہت اداس ہیں۔ کہیں وہ اپنے ملک کے باسیوں سے شکوہ کناں ہیں تو کہیں وہ بہنوں اور بیٹیوں کو اپنی عصمتوں کی حفاظت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح اور بھی کئی دیگر متفرق خرابیوں کو زیرِ بحث لایا ہے۔ ان مسائل اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کرنے کے بعد وہ اپنے مضامین میں ان کا حل بھی بتاتے ہیں۔ انور صاحب ایک نرم دل رکھتے ہیں شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنی تحاریر میں معاشرتی موضوعات کو ہی اُجاگر کیا ہے۔۔۔ گو کہ یہ موضوعات روایتی ہیں لیکن انور بھائی نے ان کو اپنے خوبصورت انداز میں بیان کر کے انہیں جدت عطا کی ہے۔ سیفؔ نے بھی تو کہا تھا:

سیفؔ اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے

ورنہ دنیا میں کوئی بات، نئی بات نہیں

میں آپ قارئین کا زیادہ وقت نہیں لیتا، آپ اس کتاب کو ضرور پڑھیں اور اپنی قیمتی آراء سے نوازیں۔ ایک لکھاری یا شاعر کی محنت اس وقت وصول ہوتی ہے جب اسے اپنے قارئین کی طرف سے کتاب پر تبصرے موصول ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آپ کا وقت ضائع نہیں کرے گی۔ آخر میں انور بھائی کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ پاک آپ کے قلم میں برکت عطا فرمائے اور آپ کو مزید کامیابیاں و کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ والسلام

شارق عزیزؔ میاں اعوان (نوشہرہ سٹی، سون ویلی)
شاعر/کالم نگار/افسانہ نگار
ایم ڈی: سون ویلی لٹریری سوسائٹی (سون ویلی)

گلہائے انور

کہانیوں کو لفظوں کے وجود میں لانے والا دماغ، آپ بیتی جھیلنے اور محسوس کرنے والا دل اور اپنے پیغام کو لکھنے والے ہاتھ کا کمال ہوتا ہے۔ مصنف جو اپنے جذبات، تجربات و احساسات، اپنی آپ بیتی، اپنے دکھ درد اور معاشرے سے جو گلے شکوے ہیں، کو الفاظ میں پرو کر ہم تک پہنچاتا ہے۔ وہ معاشرے میں ہونے والی کارگزاریوں زیادتیوں ناانصافیوں اور معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم پیار محبت میں ہوئی ناکامیوں کے بارے میں اپنے لفظوں کے ذریعے ہمیں معاشرے کا چہرہ دکھاتا ہے۔

ہم لوگ جو اپنی اپنی زندگیوں میں اپنے اپنے اعمال جذبات و احساسات جی رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں نہیں اندازہ ہوتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اپنی زندگی سے نکل کر معاشرے میں دیکھ کر پتہ چلتا ہے۔ زندگی مشکل ہے، یا آسان ہے، خوبصورت ہے، یا کیسی۔ مصنفین خواتین و حضرات اپنے قلم سے ہمیں ہماری اپنی زندگیوں سے نکال کر معاشرے میں گزر رہے حالات و واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔ جس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کو ملتا ہے۔ بہت سے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں معاشرے میں کئی طرح کے لوگ ہیں۔ امیر، کچھ بہت امیر اور غریب کچھ بہت غریب، کوئی مال و دولت کی فکر میں، کوئی محبوبہ کی یاد میں تڑپتا عاشق، کوئی

معاشرے کے ظلم سے ٹوٹا ہوا، کوئی اپنوں کا لُٹا ہوا، کوئی رو رہا کوئی ہنس رہا، کوئی پا رہا کوئی کھو رہا ہے۔

سبھی لوگ اپنے اپنے دل و دماغ میں کئی طرح کے سوالات رکھتے ہیں۔ جن کا جواب ان کہانیوں میں مل ہی جاتا ہے۔ جن کو مصنفین منفرد لب و لہجے کے ساتھ اپنے اپنے خیالات و نظریات اور تجربات سے مزین کرتے ہیں۔ ہم میں سے کئی ہیں۔ جو کہانیاں ناول افسانہ پڑھ کر صرف لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور کئی ایسے ہیں جو سبق حاصل کرتے ہیں اور کئی ایسے بھی جو اپنے سوالوں کے جواب پا لیتے ہیں۔

خراج تحسین پیش کرنا چاہیئے ان مصنفین کو جو ہمارے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے ہیں اپنے قلم سے۔ ان میں سے ایک نوجوان مصنف، سماجی رابطے کے مواصلاتی نظام (فیسبک) اور مختلف رسائل و جرائد میں اپنے قلم کا زور دکھانے والے معروف نوآموز قلمکار محترم جناب انور زیب انور صاحب بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی اس کتاب ادھورے خواب میں انتہائی خوبصورتی سے پورے احساسات کے ساتھ مختلف زندگیوں کے حالات و واقعات کو ماہرانہ اندازِ بیاں سے صفحہ قرطاس پر بکھیرا اور پھر اپنے اس مجموعہِ تحاریر سے بھرپور پیغام کو یعنی ادھورے خواب کو ہم تک پہنچا کر مصنف ہونے کا حق ادا کر دیا۔

اللہ پاک ذورِ قلم میں اضافہ فرمائے اور اپنی تمام تر ادبی و علمی کاوشوں کے ساتھ کامیابی، صحت یابی اور سلامتی و خوش نصیبی سے نوازتا رہے آمین ثم آمین

ساجد عباس ساجد (کراچی)

بانی و مدیر اعلیٰ ماہنامہ عین عشق برقی جریدہ

آج پھر وہ کافی بے چین دکھائی دے رہا تھا، مسجد میں نماز بھی بہت تیزی سے اور جلدی میں پڑھی، جیسے بس ٹکریں ماری ہو، اور پھر جلدی سے سلام پھیر کر مسجد سے باہر کی طرف لپکا، ایک عجیب سے بے چینی اُس کے چہرے پہ عیاں تھی، اور ساتھ میں ایک اُمید بھی، وہ ایک درمیانے قد کا نوجوان دیکھنے میں انتہائی شریف، اور نمازی بھی، مگر عشق کے ہاتھوں مجبور، وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا جلد ہی اُس جگہ پہنچ گیا جہاں اُس نے جانا تھا۔

یہ گرلز کالج کا گیٹ تھا، اور چھٹی ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی، مگر اُس کی بے چینی، وہ کبھی ہاتھوں کو آپس میں مسلتا، کبھی اِدھر اُدھر ٹہلتا، اور کبھی سڑک پر پڑے کسی پتھر کو ٹھوکر مارتا، گیٹ پر کافی رش تھا، لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مگر وہ، وہ اپنی بہن یا بیٹی کو لینے نہیں بلکہ، کسی اور کی بہن، بیٹی کی خاطر آیا ہوا تھا، مگر کسی کو کیا معلوم کون کیوں آیا ہوا ہے۔

وہ کافی بے چینی سے چھٹی ہونے کا انتظار کر رہا تھا، ایک ایک لمحہ گھنٹوں پر محیط تھا، وہ بے چین تھا، دل کی دھڑکن تیز تھی، وہ سوچ رہا تھا، نہ جانے آج کیا بنے گا وہ کامیاب ہوگا یا نہیں؟ کب چھٹی ہوگی؟ کب اُس کا مقصد پورا ہوگا؟ وہ گھبرا رہا تھا مگر اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی خاطر

ہلکا ہلکا گنگنا رہا تھا اپنی ہونٹوں کو بھینچ کر، ہوں ہوں ہوں، پھر گھنٹی بجی اور گیٹ کُھل گیا۔

لڑکیاں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں، یوں لگتا تھا جیسے کسی قید خانے سے نکل رہی ہوں، یا پھر بھیڑ بکریوں کا ایک بہت بڑا ریوڑ ہو، آج وہ مصمم ارادہ کر کے نکلا تھا۔ آج وہ ٹھان کر آیا تھا کہ اپنا مقصد ضرور پورا کرے گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

ایک مدت سے وہ محض یک طرفہ عشق کر رہا تھا، مگر اب وقت آ گیا کہ وہ کچھ کر کے دکھائے۔ وہ گیٹ سے باہر آتی ہوئی لڑکیوں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید وہ اپنے والی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں وحشت اُبھرنے لگی۔ جسم پر کپکپی سی طاری تھی۔ دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مگر ابھی تک اس کا ٹارگٹ نظر نہ آ سکا تھا وہ کھڑا رہا، دیکھتا رہا، لوگ اپنی بیٹیوں کو لے کر جا رہے تھے۔ لڑکیاں ایسے نکل رہی تھیں جیسے کسی جیل سے رہائی مل گئی ہو جیسے کوئی سیلاب ہو بچیوں کا، تیز تیز کچھ لڑکیاں پیدل ہی گھر کی جانب رواں دواں تھیں، کئی والدین موٹر سائیکلوں پر بچیوں کو لے کر جا رہے تھے مگر وہ اب تک کھڑا دیکھ رہا تھا وقت گزرتا گیا اور پھر لڑکیوں کا رش کم ہونے لگا شاید کافی لڑکیاں جا چکی تھیں والدین بھی جا چکے تھے بس چند ایک گیٹ کے باہر موجود تھے اور ان میں وہ بھی، اُس کی آنکھوں کی حیرانی ویرانی میں تبدیل ہونے لگی، مایوسی کے بادل اُس کے دل پر چھانے لگے۔

آج اس کا مکمل ارادہ تھا۔ اس کا سامنا کرنے کا، اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کا، بس یہی ارادہ تھا اس کا، وہ اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا اس دلکش پری کو جو اس کی محبت سے ناآشنا تھی اپنے دل کا حال بتانا چاہتا تھا، اپنے من میں مقیم اس مجسمے کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مگر شاید وہ لڑکیوں کی بھیڑ میں آج پھر چلی گئی اور اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ کچھ دیر مزید کھڑا رہا۔ مگر بے سود، وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا اپنی

حسرت پر رونے لگا جس کی خاطر نماز بھی ٹھیک سے نہ پڑھ سکا خدا کو بھی ناراض کیا اور وہ اپنی محبت کا اظہار تو کیا کرتا، وہ اُس کی ایک جھلک بھی دیکھ نہ پایا۔۔۔۔

پھر وہ ناکام حسرتوں کو لیے آہستہ آہستہ دوسری جانب چل پڑا۔ اُس کے ذہن میں نہ جانے کہاں سے کسی شاعر کا یہ شعر آن وارد ہوا۔۔۔۔

نہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

☆☆☆

ارے بیٹا تم آج پھر رو رہی ہو؟ آؤ اندر آجاؤ، کیا ہوا کیا پھر کوئی بات کی ہے تمہارے سسرال والوں نے ۔ بوڑھے باپ مجید نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دروازے سے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی اور رو رہی تھی، بغیر بولے اثبات میں سر ہلا دیا، باپ سمجھ گیا کہ اس کے ظالم سسرال والوں نے آج اسے پھر طعنے دیئے ہوں گے، طنز کیا ہوگا اور اسے نیچا دکھانے کے لیے نہ جانے کیا کیا نہ کہا ہوگا۔ یہ اس کی دوسری بیٹی تھی مہہ جبین۔

مہہ جبین روتے ہوئے کہنے لگی۔ ابا میں اب اُن کے روز روز کے طعنے برداشت نہیں کر سکتی میں بہت تھک چکی ہوں ہر وقت کے طعنے ہر وقت جہیز کم ہونے پر طنز، ساس سسر کی باتوں میں آکر شوہر بھی اُن کے ساتھ مل جاتا ہے اور آج پھر مجھے نکال دیا ہے گھر سے، مجھے پتہ ہے کہ آپ نے کس غربت میں زندگی گزاری ہے کتنی محنت مزدوری کی، رات دن کام کر کر کے میری لیے جہیز اکٹھا کیا اور وہ سنگدل پھر بھی مجھے جہیز کم ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ مجید سُنتا رہا پھر اُس کا دل بھر آیا اور وہ بھی اپنے آنسو نہ روک سکا، کہنے لگا، میرے بیٹے! صبر کرو۔۔۔ ہم نے صرف صبر کرنا ہے اُن کے ساتھ نبھا کرنا ہے وہ چاہے کچھ بھی کہہ لیں تم تو جانتی ہو تیری بڑی بہن ماہین کے ساتھ کیا ہوا، اللہ نہ کرے کہ تیرے ساتھ ایسا کچھ ہو، میں تو جیتے جی ہی مرجاؤں گا۔ نہ بابا نہ، ایسی باتیں نہ

کریں آپ، میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں، آپ ایسا نہ کہیں آپ ہی تو ہیں میرا آخری سہارا۔ مہہ جبین نے روتے ہوئے کہا۔ وہ رو رو کر اپنے بوڑھے باپ کو اپنے دُکھڑے سُنا رہی تھی اور مجید صاحب یعنی اُس کا بوڑھا باپ اپنے کندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے اپنے آنسو صاف کرتا رہا وہ کوشش کر رہا تھا کہ اُس کی بیٹی کو اس کے آنسو نہ نظر آئیں مگر یہ تو فطری آنسو ہوتے ہیں، بیٹی کا دُکھ سُن کر تھم نہیں سکتے۔

وہ رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیسے اس نے پہلی بیٹی کے لیے جہیز اکٹھا کیا، کتنی محنت کی، دن رات ایک کر کے اس غریب نے اپنی پہلی بیٹی کے لیے جہیز اکٹھا کیا، اُس کی شادی کی، اس کے باوجود اُسے بھی ایک دن چین سے نہ رہنے دیا گیا۔ اُسے بھی غریبی کے طعنے ملتے تھے حتیٰ کہ اُسے طلاق دے دی گئی اور پھر بیٹی کی طلاق کا اُس کی ماں جو کہ دل کی مریض تھی برداشت نہ کر سکی اور ہارٹ اٹیک ہونے کی وجہ سے چل بسی پھر یہی باپ ہی تھا جو دونوں بیٹیوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ بیٹے تو تھے نہیں جو اُس کا دکھ درد بٹاتے مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارا اور دن رات ایک کر کے اُس نے دوسری بیٹی کے لیے جہیز اکٹھا کیا لیکن یہ ظالم سماج کسی کو سُکھ چین سے جینے نہیں دیتا۔ اب مجید بیٹیوں کا دکھ سہہ سہہ کر تقریباً پاگل ہونے کو تھا۔

ابھی مہہ جبین کو سسرال گئے کم و بیش دس دن بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ پھر ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ آج پھر سسرال کے طعنے عروج پر تھے اور بات ہاتھا پائی تک آ گئی تھی شوہر نے صاف کہہ دیا کہ تیرا بھکاری باپ کہاں ہے، بُلا اُسے۔۔۔ شادی سے پہلے جو شرط رکھی تھی ابھی تک اُس نے پوری نہیں کی، آخر وہ کب موٹر سائیکل لے کر دے گا تھوڑا سا جہیز دے کر اُس نے ہمیں خرید لیا ہے کیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر آج اُس نے موٹر سائیکل نہ دلائی تو بس۔۔۔۔۔۔۔ نکل جا میرے گھر سے اور اُس نے دھکے دے کر مہ جبین کو گھر سے نکال دیا، ساس سسر بھی اُس کی تائید کرتے رہے اُنہوں نے منع نہیں کیا بلکہ اُلٹا ساتھ مل کر طعنے دیتے رہے وہ بیچاری گھر سے

نکل گئی۔

آنسوؤں کی لڑی جاری تھی وہ ایک انجان راستے پر چل پڑی، وہ سوچ رہی تھی کہ بابا کے گھر جا کر اُسے کب تک پریشان کروں گی وہ بے چارہ، اُس نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا اُس کا کوئی قصور نہیں، میں ہی بدنصیب ہوں، میں ہی بدقسمت ہوں، نصیبوں جلی، وہ چلتی جا رہی تھی معلوم نہ تھا کہاں جا رہی ہے لیکن باپ کے گھر نہیں کہیں دوسری سمت میں، وہ چلتی رہی۔۔۔ چلتی رہی۔۔۔ راستے میں کسی نے نوٹس نہ لیا کہ غریب لڑکی کیوں رو رہی ہے کہاں جا رہی ہے دنیا اپنے کاموں میں اپنے غموں میں مصروف تھی کوئی اپنا نہ تھا۔۔۔ ہاں اگر کوئی دیکھ رہے تھے تو۔۔۔ گندی نظروں سے، غلط نگاہوں سے، مگر وہ چلتی رہی۔۔۔ چلتے چلتے ہی راستے میں دریا پڑتا تھا وہ دریا پر جا پہنچی۔

وہ سوچنے لگی، گھٹ گھٹ کر جینے سے کیا فائدہ؟ میرا کوئی حق نہیں ہے جینے کا، جیتی رہی تو طعنے ختم نہیں ہوں گے، بابا موٹر سائیکل کہاں سے لا دیں گے وہ بے چارہ اپنی دو وقت کی روٹی مشکل سے کماتا ہے۔ نہیں نہیں اب میں جینا نہیں چاہتی، میں بابا کی مشکلات میں ہرگز اضافہ نہیں کروں گی، بس بہت ہوا، میں پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔ مجھے پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ میں اب تک کیوں ہوں؟ اور پھر۔۔۔ اور پھر اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

وہ حوا کی بیٹی اپنے دکھ درد لے کر اپنے زندگی کے تمام غم لے کر اپنی خوشیوں کو قربان کر کے چلی گئی اپنے رب کے پاس۔ کوئی دیکھنے والا نہ تھا، کوئی روکنے والا نہ تھا، اور پھر دریا کی موجیں اُسے کہاں سے کہاں لے گئیں۔

☆☆☆

اب بھی کبھی میں زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے لگتا ہوں تو اللہ جانے اس کو کیا ہوتا ہے کہ یہ میرے خلاف ہو جاتا ہے۔ اس کی حرکتیں بھی عجیب ہیں۔ یہ چاہتا ہے کہ بس میرا ہی بول بالا ہو۔ اکثر اس کی اور میری نہیں بنتی، خود تو عاشق مزاج ہے ہی مجھے بھی اُکساتا ہے حسن پرست کہیں کا۔ جہاں صنفِ نازک دیکھی وہاں متوجہ ہو جاتا ہے مجھے اس کی یہ عادات بالکل اچھی نہیں لگتیں مگر مجبوری یہ ہے کہ رہنا بھی اکٹھے ہے، ایک دوسرے کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ اس کی مرضی جو کہتا پھرے، جو کرتا پھرے، کون منع کرتا ہے اسے اور یہ مانتا بھی کس کی ہے اور تو اور میرے فرائض میں بھی ٹانگ اڑاتا ہے یہ تو، بڑی گڑبڑ کھڑی کر دیتا ہے۔ جانے اسے کون سمجھاتا ہے۔ کون پٹیاں پڑھاتا ہے۔ سمجھ ہی نہیں آتی مجھے تو، یہ میری جان کا دشمن معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا بے وفا اور مطلب پرست اس نامراد نے تو ہمیشہ میرا ہی خسارہ سوچا ہے عذاب بن گیا ہے یہ میرے لیے مگر پھر بھی اس کے بغیر میرا گزارا بھی تو نہیں کوئی اور ہوتا تو میں اسے چھوڑ دیتا بس اس کی مانے چلا جاتا ہوں اور اپنا خسارہ کیے جاتا ہوں اور جب اس کی نہ مانوں تو جان عذاب کو آ جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ اکثر غلط ہی ہوتا ہے ہمیشہ اپنے فائدے کا ہی سوچتا ہے یہ۔ چاہے دوسرے کو نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں دل مرا، عجیب ہے، عجیب خواہشات ہیں اس کی، اس دل کی، یہ جو ہے ناں دلِ نامراد!

اس دل نے زندگی کو اجیرن بنا دیا
ناسور کی طرح ہے یہ میرا حضور دل

ایک دن کی کمائی

امجد گاؤں میں بے روزگاری سے تنگ آیا تو اُس نے شہر کا رُخ کیا۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ماں باپ کا واحد سہارا تھا، اپنی کوئی زمین وغیرہ نہ تھی باپ دوسروں کی زمینوں پر کام کر کے بمشکل گھر کا گزارا کر رہا تھا۔ وہ بیس سال کا نوجوان تھا اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کا سہارا کیسے بنے اور گھر کے اخراجات میں اپنے باپ کا معاون کیسے بن جائے، وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن گاؤں میں رہ کر اُسے یہ سب ناممکن نظر آ رہا تھا تبھی اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر جائے گا۔ امجد زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہ تھا پڑھائی کا شوق تو تھا مگر گھریلوں حالات کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اُس کا خیال تھا کہ شہر جا کر کوئی ملازمت وغیرہ کر کے اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکے گا۔ چنانچہ ماں باپ کی اجازت سے اور دوستوں سے کچھ رقم اُدھار اٹھا کر وہ شہر جا پہنچا۔ آج دو مہینے ہونے کو آ گئے مگر کوئی ملازمت نہ ملی، وہ جو رقم اُدھار لایا تھا وہ بھی ختم ہونے کو تھی، شہر سے تھوڑا دور ایک کمرے پر مشتمل وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا، وہ روزانہ صبح سویرے روزی کی تلاش میں نکلتا سارا دن مارا مارا پھرتا رہتا۔ کبھی کسی فارم، کبھی کسی فیکٹری میں، وہ مختلف سٹوروں پر بھی جاتا رہا مگر کچھ نہ بنا۔

آج بھی سارا دن مارا مارا پھرتا رہا، کوئی نوکری نہ ملی۔ کہیں سے کوئی امید بر نہ آئی۔

اُس نے ہمت نہ ہاری، اگلے دن پھر، اُس سے اگلے دن پھر، مگر سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا، کئی دن مزید گزر گئے۔ اب تو اس کے پاس کھانے کے پیسے بھی نہ بچے تھے۔ تھک ہار کر شہر کے وسط میں پارک میں دوپہر گزارنے کو بیٹھ گیا۔ اتنی مایوسیوں اور ہر جگہ سے ملازمت، کے انکار پر وہ دلبر داشتہ سا ہو گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ گھر واپس چلا جائے۔ لیکن اس طرح خالی ہاتھ؟ نہیں نہیں۔۔۔

اگلے دن وہ پھر نئی اُمید لیکر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مختلف جگہوں پر نوکری کی بات چل رہی تھی۔ لیکن دو ماہ سے زائد ہونے کو تھے، کوئی جاب لگ ہی نہیں رہی تھی وہ پھر مایوس ہو گیا، اتنا مایوس، زندگی سے بیزاری کی حد تک، آج پھر ایک اور دن گیا، بے روزگاری میں، وہ حسبِ معمول مایوس واپس لوٹ رہا تھا، واپسی پر اُس کی ملاقات ایک مزدور شخص سے ہوئی۔ اُس نے امجد کا حال سُنا تو اسے تھوڑی سی اُمید دلائی کہ وہ اسے مزدوری کا کام دلوا سکتا ہے اور امجد کو کل اُس سے ملنے کا کہا۔ وہ بہت خوش ہوا، چلو ایک اُمید تو لگی۔ اگلے دن امجد مقررہ وقت اور جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ شخص وہاں پہلے ہی موجود تھا جس نے اس سے آنے کا کہا تھا وہ کچھ مزدوروں سے کام کروا رہا تھا۔ امجد کو دیکھ کر وہ اُسے پاس ہی ایک جگہ پر لے گیا جہاں کچھ دوسرے مزدور اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس نے امجد سے کہا کہ یہ کام ہے ان مزدوروں کے ساتھ مل جاؤ شام کو تمہیں دیہاڑی مل جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ امجد کام دیکھ کر بہت گھبرایا۔ اُس نے تو ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا یہ تو بہت مشکل کام تھا، وہ یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ہمت کر کے کام کرنے لگ گیا وہ سیمنٹ کی بوریاں اُٹھا کر تیسری منزل پر پہنچانے میں مصروف ہو گیا۔ پچاس کلو کی بوری، اُس نے تو ابھی تک بستے کے علاوہ کچھ وزن اُٹھانا نہ سیکھا تھا اور یہ بہت مشکل کام تھا۔ بہرحال وہ کام کرنے لگا، وہ بہت ہی ڈھیلا ڈھیلا کام کر رہا تھا۔ بے دلی کے ساتھ، جیسے وہ یہ کام نہ کرنا چاہتا ہو، خیر کام کرتے کرتے شام ہو گئی اور پانچ بجے جب اُسے چھٹی ملی تو وہاں سے اُسے پانچ سو روپے مل گئے۔ پانچ سو روپے لیکر وہ بہت خوش ہوا اور واپس جانے لگا کہ اُسے

پیچھے سے آواز آئی، سنو!۔۔۔کل مت آنا۔امجد نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی شخص جس نے اُسے یہ کام دلوایا تھا کہہ رہا تھا یہ تمہارے بس کا روگ نہیں، ہمیں ایسے ڈھیلے لوگ نہیں چاہئیں، آج بھی دن ضائع ہوا ہے،ہم کوئی اور مزدور رکھ لیں گے۔ یہ سن کر جیسے اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ بمشکل کام ملا تھا مگر یہ کیا۔۔۔؟ آج ہی کام ملا اور آج ہی چھٹی کرادی گئی؟ وہ بہت دکھی ہوا۔

بوجھل بوجھل قدموں سے وہ واپس جا رہا تھا، سوچوں میں گم، وہ سوچ رہا تھا، وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا، شاید کچھ بھی نہیں، ایک اُمید لگی تھی وہ بھی ختم، وہ چلتے چلتے بازار سے گزرا، ایک دوکان پر رُکا، اپنے آج کے کمائے ہوئے پیسوں سے کچھ وہاں سے خریدا اور گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

راستے میں وہ سوچ رہا تھا آج پانچواں دن ہے مالک مکان کرائے کا تقاضہ کر رہا ہے، ہے بھی بدتمیز قسم کا، گالیاں تک دے ڈالتا ہے آج پھر شام کو وہ آئے گا آج پھر گالیاں، ان پیسوں سے تو وہ کھانا بھی مشکل سے کھا سکتا تھا کرایہ کہاں سے دے گا خیر وہ گھر پہنچ گیا۔

رات ہوئی ، پھر اگلا دن چڑھا۔ مالک مکان آ پہنچا دروازہ بند تھا اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا پھر کھٹکھٹایا پھر کھٹکھٹاتا رہا، مگر امجد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا کہ شاید ابھی سو رہا ہوگا دو گھنٹے بعد پھر آیا تو اب بھی دروازہ بند ہی تھا اُس نے بڑے زور زور سے دروازہ بجایا، آوازیں دیں ساتھ میں گالیاں بھی، مگر بے سود، مالک مکان کو بہت غصہ آ رہا تھا وہ کہہ رہا تھا یہ آج کل کے نوجوان اتنی دیر تک سوتے ہیں، کیا بنے گا ان کا، وہ دروازہ بجاتا رہا، اسی اثناء میں محلے دار بھی اکٹھے ہوگئے سب حیران تھے پھر پریشانی ہوئی اور بڑھتی گئی، کہ کہیں؟ کسی نے کہا دروازہ توڑ دو، نجانے اسے کچھ ہو نہ گیا ہو، لوگوں نے مل کر دروازہ توڑا۔ یہ کیا؟؟ سب حیران رہ گئے کمرے میں اُس کی لاش پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی پلاسٹک کی نئی چمکدار ڈوری کے ساتھ، شاید اُس نے بازار سے یہی خریدی تھی اپنی ایک دن کی کمائی سے۔ ☆☆☆

جوں جوں اولاد جوان ہوتی ہے ماں باپ کی ذمہ داریاں بڑھتی ہی جاتی ہیں اولاد خوشی کا باعث ہوتی ہے لیکن یہ سماج کسی کو کب خوش رہنے دیتا ہے معاشرے کے ہر طبقے میں کوئی نہ کوئی ناسور موجود ہوتا ہے جو کہ ہمیشہ معاشرے کو زخم دیتا رہتا ہے۔

دن کے تین بج چکے تھے مگر نور ابھی تک سکول سے گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ زیادہ دیر ہونے پر نور کے باپ شکور کو پریشانی ہوئی بیوی سے کہنے لگا۔ پہلے تو کبھی نور نے اتنی دیر نہیں لگائی۔۔۔اللہ خیر کرے آج کیا بات ہے بیوی کہنے لگی، سہیلی کے گھر رُک گئی ہوگی آجائے گی وہ، آپ پریشان مت ہو، آجائے گی وہ۔۔۔لیکن کچھ دیر اور گزر گئی تو شکور کی بے چینی میں اضافہ ہوا اور وہ اُٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا سکول کے راستے کی طرف، اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کہ کہیں سے نور آ رہی ہوگی گلی میں اِکا دُکا بچیاں کھیلتی کودتی سکول سے واپس اپنے اپنے گھروں کی جانب جا رہی تھیں وہ پُراُمید تھا کہ انہیں بچیوں میں ہی نور بھی آ رہی ہوگی مگر وہ دیکھتا گیا نور تو ان میں نہیں تھی وہ چلتا ہوا تھوڑا آگے گیا نور کی سہیلی کے گھر پہنچ گیا دروازے پر دستک دی تو نور کا باپ باہر آیا۔

نور آئی یہاں؟ شکور نے پوچھا۔

نہیں یہاں تو نہیں آئی۔۔۔جواب آیا۔۔۔پھر سہیلی کے باپ نے گھر کے اندر جا کر بھی پتہ کر کے

بتا دیا کہ نور تو یہاں نہیں آئی ۔ یہ باتیں سُن کر شکور کی دھڑکن تیز ہوگئی اور وہ پیچھے مڑا اور دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔

گلیوں میں پھرنے لگا کہ کہیں نور آ رہی ہوگی مگر بے سُود، وہ مارا مارا پھرتا رہا پھر گھر پہنچ گیا کہ شاید نور گھر آ گئی ہوگی مگر نور ابھی تک نہیں آئی تھی شام ہوگئی تھی اور نور کا کوئی پتہ نہ تھا شکور کے رشتہ دار اور دیگر محلے داروں کو بھی علم ہو چکا تھا اور کئی لوگ بار بار آ کر ہمدردی کے طور پر پوچھ رہے تھے کہ نور آ گئی ؟ پورے محلے میں پریشانی کا سماں تھا اب اکیلا شکور ہی نہیں پورا محلہ نور کو ڈھونڈنے میں لگ گیا۔

کوئی اِدھر جا رہا ہے تو کوئی اُدھر، مسجد میں اعلان کرا دیا گیا کہ نور کہیں ملے تو گھر پہنچا دیں کیونکہ وہ صرف دس سال کی چھوٹی بچی تھی ، ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا، رات ہوگئی پر نور نہ آئی ۔ ماں باپ کا رو رو کے بُرا حال تھا۔صبح صبح کرموں چاچا اپنی بھینسوں کا چارہ کاٹنے کھیت میں داخل ہوا۔ابھی تھوڑا سا گھاس ہی کاٹا تھا کہ اچانک اس کی نظر پڑی۔کوئی لاش تھی شاید۔۔۔وہ گھبرا گیا ۔۔۔یہ بچی کس کی ہے۔۔۔پھر وہ پہچان گیا، شکور کل اپنی بچی ڈھونڈ رہا تھا یقیناً یہ اُس کی بچی نور ہی ہے اُس نے آوازیں لگا کر دوسروں کو بلا لیا۔

وہ نور کی لاش تھی جو کھیتوں میں موجود تھی اُس کا دوپٹہ اُس کے گلے میں ایسے موجود تھا جیسے دوپٹہ کھینچا گیا ہو۔شکور کو بھی بُلا لیا گیا، بلا کا کُہرام مچا ہوا تھا پورا علاقہ اکٹھا ہو گیا۔عورتیں دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں۔شکور بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔اُسکی معصوم دس سال کی بچی، کس نے مارا آخر، کیا بگاڑا تھا اُس نے کسی کا، کچھ دیر میں پولیس کو بلا لیا گیا۔موقعے کا جائزہ لینے اور شواہد لینے کے بعد پولیس نے لاش اُٹھالی۔بچی کو بے دردی سے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔

نامعلوم ملزم کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا دو چار دن گزر گئے تفتیش ہوتی رہی پر ایک نوجوان کو شک کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا، نوجوان پہلے تو انکار کرتا رہا پر جب لتر پڑے تو اعترف جرم

کرلیا۔واقعہ جنسی زیادتی کا تھا اُسکے نہ ماننے کی وجہ سے اُس کا گلا دبا کر مار دیا گیا تھا اُس وحشی درندے ہوس کے پجاری نے ۔نوجوان اُسی علاقے کا تھا سب اُس پر تھُو تھُو اور لعن طعن کر رہے تھے ۔ملزم گرفتار ہو چکا تھا۔کیس عدالت میں چلنے لگا، عدالت نے ثبوت مانگے پھر مزید ثبوت مانگے، پیشی پر پیشی لگنے لگی، ملزم کے وارثان نے بہت تگڑا وکیل کرلیا، تھوڑے ہی عرصے میں ملزم ضمانت پر رہا ہو گیا۔

نور کا گھر ویران ہو چکا تھا۔باپ پاگل ہونے کے قریب تھا مگر انصاف دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا پھر کئی ہفتے گزر گئے عدالت میں پیشیاں پڑتی رہیں، مہینے گزر گئے اور پھر بات سالوں تک جا پہنچی مگر انصاف کہیں نظر نہ آیا۔

☆☆☆

وہ لڑکی اکثر روتی رہتی تھی بلکہ یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا زیادہ تر روتی ہی رہتی تھی۔ میں جب بھی دیکھتا تو وہ رو رہی ہوتی تھی۔ وہ ہمارے پڑوس کے گھر میں شاید نوکرانی تھی میرا اِن کے گھر آنا جانا تھا اس لیے وہ میری نظروں میں رہتی تھی انتہائی شریف لڑکی، پانچ وقت کی نمازی حتیٰ کہ تہجد گزار بھی، لیکن اپنے کام میں ہمہ وقت مگن رہنے والی لڑکی تھی، میں اُسے جب بھی دیکھتا وہ رو رہی ہوتی تھی، کس لیے۔۔۔۔۔ واللہ اعلم۔۔۔۔۔ کیا ماجرا ہوگا؟ وہ کیوں روتی ہے؟ مجھے بہت افسوس ہوتا، اُس پہ ترس آتا پھر میں نے ایک دن موقع پا کر پوچھ ہی لیا، آخر کیا معاملا ہے؟ کیوں ہمہ وقت اُداس رہتی ہو؟ کیوں روتی رہتی ہو؟ کیا مالکان بہت سخت ہیں؟ مار پیٹ تو نہیں کرتے؟ وہ میری بات سُن کر اور بھی روئی، پر چلی گئی۔ کچھ نہ بتایا، میں نے کچھ دنوں بعد پھر وہی سوال کیا پھر پوچھا تو اب کے بار وہ ہمت کر کے بولی۔ یہ مالکان تو جیسے بھی ہیں لیکن میرے ماں باپ۔۔۔۔

وہ اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ رکھ سکی سنہری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اُس کے گال پر موتیوں کی طرح بہہ نکلے پھر سسکتے ہوئے بولی، میرے ماں باپ نے مجھے اِن کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔

☆☆☆

کل ہم اپنا بدلہ ضرور لینگے کل کا دن ہمارے لیے بڑا اہم ہے سب سمجھ گئے ناں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے جیسا میں نے کہا سب ویسا ہی پلان کے حساب سے ہوگا دیکھتا ہوں اس بار وہ میرے جال سے کیسے نکلتا ہے اب آئے گا اصل مزہ ہاہاہا۔

وہ ایک لمبا چوڑا تقریباً دس فٹ کا بھیانک شکل گندے بکھرے بال والا انسان نما شخص تھا جو اپنے گرد موجود ساتھیوں کو سمجھا رہا تھا کہ کل ہم نے اپنا بدلہ کیسے لینا ہے۔ دوسری طرف اپنے محل سے نکلتا ہوا شہزادہ سلیم ماحول کا جائزہ لے رہا تھا اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی وہ کہہ رہا تھا شاباش بلکل اسی طرح محنت سے کام کرتے رہو جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ ہم نے آج ہی یہ سارا کام ختم کرنا ہے۔ کچھ لوگ محل سجانے میں مصروف تھے۔

حضور ذرا یہاں آ کے یہ سب بھی دیکھ لیجیے گا، یہ شاہی باورچی کی آواز تھی، اُس کی آواز پر شہزادہ متوجہ ہوا اور اُس طرف چلا گیا "واہ بہت خوب بہت بڑھیا"، پکوان چکھ کر شہزادے نے شاہی باورچی کو خوب سراہا۔ بہت اچھا انتظام کیا ہے اور بھی اسی طرح اچھے اچھے پکوان تیار کرو کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ شہزادہ بڑا خوش تھا اور خوشی خوشی سارے انتظامات خود ہی دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ شہزادہ تھا اُس کا یہ کام ہی نہیں تھا محل میں اور بہت سے انتظامی امور والے لوگ موجود

تھے جو بالکل ٹھیک کام کر سکتے تھے مگر چونکہ کل شہزادے کی شادی تھی اور وہ بھی شہزادی بلقیس کے ساتھ۔شہزادہ بہت خوش تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی دشواری یا مسئلہ درپیش نہ ہو۔

شہزادہ سلیم اور شہزادی بلقیس بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے وہ دونوں بڑے خوش تھے۔ یہاں شہزادہ اپنی شادی کے انتظامات دیکھ رہا تھا اور وہاں شہزادی کنیزوں کے درمیان بیٹھی اپنے لیے کپڑے زیورات جوتے وغیرہ پسند کر رہی تھی دنیا کے سب سے قیمتی اور خوبصوت لباس، زیورات جوتے وغیرہ اُس کے سامنے رکھے گئے تھے وہ بڑی خوشی سے ہنستے کھل کھلاتے اپنی کنیزوں سے ہنسی مذاق کرتے کرتے اپنی لیے سلیکشن کر رہی تھی۔

شہزادی بلقیس ایک بہت ہی خوبصورت باحیا باوقار اور بہت ہی نرم خو اور رحم دل شہزادی تھی وہ اپنی کنیزوں سے بھی اس طرح پیش آتی تھی جیسے وہ ان کی بچپن کی سہیلیاں اور یا اسکی بہنیں ہو وہ ایک بہت ہی سُلجھی ہوئی، نرم خُو، انصاف پسند شہزادی تھی۔اور پھر وہ دن آ گیا جب شہزادہ اور شہزادی کو زندگی کے حسین بندھن سے منسلک ہونا تھا۔سب لوگ بڑے خوش تھے اور پورے محل میں میں جشن کا سماں تھا۔مہمان، مدعوعین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا دوسرے قریب و دور کے ملکوں سے شہزادے، شہزادیاں اور بادشاہ تشریف لا رہے تھے۔

رات گئے شادی کی رسومات شروع ہوئیں اور رقاص رقص کرنے لگ گئے۔شہزادہ اور شہزادی ایک بڑے اور اونچے سٹیج پر جلوہ افروز تھے۔شادیانے بجائے جا رہے تھے۔رقص و سرود جاری تھا اور ساتھ میں کھانے پینے کا سلسلہ بھی شروع تھا۔

سب کچھ ٹھیک تھا کہ اچانک۔۔۔۔۔۔اچانک ایک قاصد دوڑتا ہوا شہزادے کے پاس آ گیا وہ شاہی کارندہ تھا جو شاید بہت ہی اہم خبر لے کر پہنچا تھا۔اُس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ پورے عروج پر تھی۔جاری جشن میں یہ صورتحال دیکھ کر سکتہ طاری ہو گیا۔حضورغضب

ہو گیا سیمون نے حملہ کر دیا ہے وہ انتہائی گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔وہ کسی کو بھی نہیں بخش رہا، اُس نے بتایا۔دیکھتے ہی دیکھتے پورے محل میں کھلبلی مچ گئی۔شادی وادی گئی جہاں کی تہاں۔سب کو اپنی جان کے لالے پڑنے لگے شہزادے نے سپاہیوں کو تیار اور دفاع کرنے کا حکم دے دیا۔

سیمون نے محل کے قریب ایک گاؤں کو نشانہ بنایا تھا۔وہ بے تحاشا ظلم کر رہا تھا بچے بوڑھوں، عورتوں اور معصوموں تک کو نہیں چھوڑا جو سامنے آتا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔شہزادے کے سپاہی انتہائی جوانمردی کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُتر چکے تھے اور بڑی دلیری کے ساتھ سیمون کے سپاہیوں کو کچلتے جا رہے تھے۔لڑائی کافی دیر تک چلتی رہی شہزادے کے سپاہی جلد ہی سیمون کے ساتھیوں کا صفایا کرنے لگے۔اس دوران شہزادے کے کافی سارے سپاہی شہید بھی ہوئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے مر گئے لڑائی کافی دیر تک چلتی رہی اور شہزادہ اور اُس کے سپاہی لڑتے رہے مگر اس دوران سیمون کی چال کامیاب ہو گئی۔

اُس کی چال یہ تھی کہ شہزادے اور اس کے سارے سپاہیوں کو لڑائی میں مصروف کر کے خود وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھا شہزادے کے محل میں جا پہنچا اور وہاں موجود چند پہریداروں اور دیگر لوگوں کو مارتا ہوا شہزادی بلقیس کے کمرے تک جا پہنچا اور کافی خونریزی کر کے شہزادی بلقیس کو اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے گیا۔

اُدھر سیمون کی فوج کو دھول چٹا کر شہزادہ محل میں واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ہی اُس کو خبر ملی کہ شہزادی اغواء ہو گئی ہے اور سیمون اُسے کسی نامعلوم مقام پر لے گیا ہے۔خبر دینے والے نے ایک خط بھی شہزادے کو پکڑا دیا جو سیمون نے شہزادے کے لیے چھوڑا تھا شہزادے نے فوراً خط لے کر پڑھا اُس میں لکھا تھا کہ۔۔۔۔

اے شہزادے میں نے کہا تھا ناں کہ میں تیری ساری خوشیاں چھین لونگا اور تجھے تباہ و

برباد کردونگا سودیکھ لو میں نے وہ کر کے دکھایا۔ دیکھ لی آج تم نے میری طاقت"۔ شہزادے نے یہ پڑھتے ہی غصے سے اُس خط کو پھاڑ دیا۔

سیمون اس علاقے کا ایک بہت ہی ظالم جادوگر تھا جس نے دور دراز سے وحشی درندے جمع کر کے اپنے لیے ایک بڑی فوج تیار کررکھی تھی اُسکے پاس درندوں کی ایک بڑی فوج تھی اُسکے فوج میں آدمی کم اور درندے زیادہ تھے بھیڑیے اور بہت سے وحشی قسم کے جانور، اور اُسکے پاس اتنی شیطانی طاقتیں تھی کہ وہ کسی بھی انسان کو جانور اور کسی جانور سے انسان بنا دیتا تھا اپنے جادوئی طاقتوں کے ذریعے، اُسکی فوج جگہ جگہ قتل وغارت اور لوٹ مار کرتے تھے۔اور اب کی مرتبہ تو سیمون نے اپنے جادو کو مزید پختہ بنانے کے لیے بچوں کو اغوا کر کے اُن کی بھلی بھی دی تھی اور وہ اس طرح کے کئی گھٹیا کام کرتا اور اپنی وحشت پھیلائے رکھتا تھا۔اُسکی درندگی کو روکنے کے لیے شہزادہ سلیم نے کئی مرتبہ کئی بار سیمون اور اُن کے ساتھیوں پر حملے کئے اور اُس کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر اس کی فوج کو ختم کرتا رہتا۔لیکن بدبخت سیمون ہر بار اپنی شیطانی طاقتوں کی وجہ سے بچ جاتا۔اس بار اُس نے شہزادے سے اپنے سب پرانے قرضوں کو چُکانے اِن سب کا بدلہ لینے کے لیے شہزادی کو اغوا کرلیا۔

کئی دن، کئی مہینے گزر گئے۔شہزادی بلقیس کا سراغ نہ مل سکا۔شہزادہ ہر دن ہر گھڑی شہزادی کو ڈھونڈنے کے لیے اپنے سپاہیوں سمیت مارامارا پھرتا رہتا تھا۔ایک روز شہزادہ شہزادی کی تلاش میں کافی دور کے علاقے میں نکل گیا، اسی دوران وہ ایک بہت ہی ہولناک جنگل میں جا پہنچا لیکن یہاں تک بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔

وہ مایوس ہو کر واپس پلٹنے ہی لگے تھے کہ ایک سپاہی نے شہزادے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔وہ زمین پر سے کچھ اُٹھا کر شہزادے کی طرف لے کر آیا۔شہزادے نے دیکھا وہ انگوٹھی تھی غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ شہزادی کی ہی انگوٹھی ہے۔یہ دیکھ کر اُنہوں نے جنگل کی طرف پیش

قدمی شروع کردی کچھ آگے جا کر اُنہیں گھوڑوں اور انسانی قدموں کے نشان بھی مل گئے۔وہ مزید آگے بڑھے تو وہ ایک پہاڑی کے قریب جا پہنچے جو کہ گھنے جنگل میں چھپی ہوئی تھی۔اُنہوں نے پہاڑی کے گرد محاصرہ کرلیا۔پھر اُنہیں وہاں ایک غار دکھائی دی۔وہ سب بھرپور تیاری کے ساتھ غار میں داخل ہو گئے۔

وہ غار دراصل پہاڑی کے دوسری طرف جانے کا راستہ تھا وہ سب پہاڑی کی دوسرے طرف نکل گئے۔سیمون بھی غافل نہیں تھا اُسے شہزادے کی آمد کا پتہ چل گیا تھا۔اور پھر موقع ملتے ہی سیمون نے شہزادے کے سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔اس اچانک حملے سے سپاہی سنبھل نہ سکے اور کافی خون بہہ گیا سیمون کے بھی کافی ساتھی مارے گئے۔لڑائی چلتی رہی اور پھر سارے دشمن مارے گئے سیمون بھاگنے لگا تو شہزادے نے اُس کی گردن پر تلوار رکھ دی۔شہزادہ اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ابھی شہزادی کا معمہ حل نہیں ہوا تھا۔شہزادے نے کہا کہ مجھے بتا شہزادی کہاں ہے مگر سیمون ایسے کہاں بتانے والا تھا کہنے لگا تو مجھے مار بھی دے تو میں تجھے نہیں بتاؤں گا۔اب تمہیں تمہاری شہزادی کبھی نہیں ملنے والی۔وہ قہر آلود ہنسی ہنسنے لگا اور کوئی جادوئی منتر پڑھنے لگا۔منتر پڑھتے ہی ایک بہت بڑے اژدھے نے اُن پر حملہ کر دیا۔اس اچانک صورتِ حال سے گھبرا کر شہزادے نے اُس کی گردن چھوڑ دی اور سیمون پھر بھاگ نکلا۔شہزادے کے ساتھیوں نے سانپ پر پے در پے وار کر کے اُسے کافی زخمی کر دیا اور سانپ بھی بھاگ نکلا۔

شہزادے نے سیمون کا پیچھا کیا اور تھوڑی ہی دیر بھاگنے کے بعد اُسے پھر جکڑ لیا۔بول کہاں ہے شہزادی؟ شہزادے نے ایک بار پھر پوچھا۔میں تجھے اذیت کی موت ماروں گا۔جلدی بتا کہاں ہے شہزادی؟ سیمون تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ شہزادے کے ہر سوال پر ایک بھیانک قہقہہ مارتا اور پھر کہنے لگا۔تُو اب کبھی شہزادی کو حاصل نہیں کر سکے گا۔۔۔ہاہاہا ہاہاہا۔۔۔میں نے اُسے سانپ بنا دیا تھا وہی سانپ وہی اژدھا

جس نے تجھ پر حملہ کیا اور ہاہاہا ہاہاہا۔۔۔وہ ایک بار پھر ہنسنے لگا بھیانک ہنسی اور پھر اور پھر شہزادے تُو نے خود ہی اُس اژدھے کو مار دیا۔۔۔ہاہاہا ہاہاہا۔۔۔تیری شہزادی مر چکی ہے۔

شہزادے کو جیسے شاک سا لگا اور پھر شہزادے نے تلوار کا بھرپور وار کر کے سیمون کا سر تن سے جدا کر دیا سیمون کے مرتے ہی جیسے بھونچال سا آ گیا۔اُس کا جادو ٹوٹنے لگا تیز آندھی چلنے لگی گویا کوئی طوفان، گرد ہی گرد اُڑ رہی تھی اور پھر شہزادے نے دیکھا کہ وہی اژدھا جسے وہ مار چکے تھے ابھی تک مرا نہیں تھا بلکہ زخمی تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اژدھا شہزادی کا روپ دھار گیا سیمون کا جادو ٹوٹ گیا تھا اور شہزادی واپس اپنے روپ میں آ چکی تھی۔

شہزادی بہت زخمی تھی کافی خون بہہ چکا تھا۔شہزادہ اور اُس کے ساتھی خوشی سے نعرے لگانے لگے اور پھر وہ اپنی شہزادی کو لے کر اپنے محل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

☆☆☆

جھوٹ

کسی معاشرے کی خوبصورتی جانچنے کیلئے وہاں کے لوگوں کے غریبی امیری سے ہٹ کر رہن سہن، بود و باش زبان اور بولنے کے انداز بہت اہمیت رکھتے ہیں ظاہری صفائی ستھرائی سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ صاف ستھرا ہے تن بدن کی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ ذہنی خیالات، زبان، اخلاص، مروت معاشرے کی پہچان کا سبب بنتے ہیں۔ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ ہر معاشرے میں برائیاں بھی موجود ہوتی ہیں، چور، ڈاکو، لٹیرے، بدکردار، بدفعل، اسی طرح جھوٹ، غیبت، چغلخوری اور دیگر بدکاریاں معاشرے کی بدنامی کا باعث بھی بنتی ہیں۔

جھوٹ معاشرے میں ناسُور کی طرح پھیلتا ہوا وہ زخم ہے جو بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی دلدل ہے کہ جو اس میں پھنس گیا وہ پھر پھنستا ہی چلا گیا۔ ہمارے ہاں جھوٹ وبا کی طرح پھیل چکا ہے دراصل جھوٹ ہمیں ماں کی آغوش سے ملا ہوا تحفہ بھی ہے روتے بچے کو چپ کرانے کیلئے ماں جب جھوٹ بولتی ہے تو شاید اسے یہ ادراک ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ کو اس کی تربیت میں شامل کر رہی ہے اور روتے بچے کو چُپ کرانے کیلئے کہہ دیتی ہے کہ بیٹا خاموش ہو جاؤ کتا آ رہا ہے یا بعض اوقات کہہ دیتی ہے کہ فلاں بلا آ رہی ہے، ڈراونی آوازیں نکال کر بچے کو سہلاتی ہے یہ سب جھوٹ ہمارے خون میں آہستہ آہستہ رچ بس جاتا ہے اور وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

آج کل باپ اپنی شفقت میں بھی اور اولاد کی تربیت میں بھی اس بات کا خیال نہیں رکھتا اور عموماً جھوٹ بول کر ڈنگ ٹپاتا ہے جیسے کہ تو دل لگا کر پڑھ میں تجھے فلاں چیز لے دونگا فلاں چیز لے دونگا اگرچہ یہ بات شاید جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتی کہ والد شاید عزم کر چکا ہوتا ہے کہ جب پیسہ آئے گا تو یوں ہی کروں گا مگر وقت آنے پر جب یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے تو بچہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ والد کی محض طفل تسلی تھی مگر دیکھا جائے تو یہ سب ناجائز ہے، بعض اوقات جب دروازے پر دستک ہو اور والد نے دروازے پر آئے ہوئے شخص سے نہ ملنا ہو تو وہ بچوں کو یہ کہہ کر بھیج دیتا ہے کہ اسے کہو کہ والد گھر پر نہیں ہے۔ یہ چھوٹا سا جھوٹ دراصل بچے کی تربیت میں شامل ہو رہا ہوتا ہے۔ وا یہ عادت ہمارے روزمرہ کے معاملات میں یوں گھل مل جاتی ہے اور غیر محسوس انداز میں عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر بعد میں جب انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہ جھوٹ بولتے ہوئے ذرا برابر بھی شرم محسوس نہیں کرتا اور پھر جھوٹ اس کی زندگی میں حد درجہ حلول کر جاتا ہے۔ کاروبار میں اپنی چیز فروخت کرنے کے لیے جھوٹ سے کام لینے لگتا ہے اور بعض اوقات اپنی ناقص چیز کو بھی اعلیٰ درجے کی قرار دے کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس گاہک کو اس کی خامیاں وغیرہ نہیں بتاتا۔

اسی طرح ہمارے عدالتی نظام میں جب کسی کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے ثبوت مانگا جاتا ہے تو وکیل حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا کر جھوٹ موٹ کے ثبوت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس قدر جھوٹی گواہیاں دلوائی جاتی ہیں کہ وہ اپنے مؤکل کو کامیاب کرا کے اپنی بھاری فیسیں بٹور لیتے ہیں جبکہ مؤکل حضرات جھوٹ کے سہارے دوسرے فریق کو مجرم ثابت کر کے یا اپنا جرم رفع کرا کے دنیا میں تو سرخرو تو ہو جاتے ہیں مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ کے ہاں بھی ایک عدالت ہے اور وہاں جھوٹ بالکل نہیں چلتا وہاں جھوٹی گواہیاں نہیں چلتیں بلکہ وہاں جھوٹے گواہ جہنم کا

ایندھن بنا دیے جائیں گے۔ آج ہمارا معاشرہ جھوٹ کی دلدل میں اس قدر دھنس چکا ہے کہ یہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نظر نہیں آتا سوائے توبہ کے کہ توبہ کا دروازہ تو اللہ میاں نے کھلا رکھا ہوا ہے مگر اس طرف بھی وہی جاتا ہے جس کو ہدایت مل جائے اور جس کو ہدایت نہ ملے تو اللہ پاک اس کی رسی کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ جھوٹا اپنے اندوہناک جھوٹ بولنے کے سبب جہنم کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

آج کل بعض اخبارات گویا جھوٹ کی انڈسٹریاں ہیں اپنے اخبار سیل کرنے کیلئے جھوٹ تک لکھنے سے گریز نہیں کرتے ق اور جھوٹ بھی ایسا کہ جس سے ہر طرف آگ لگ جائے۔ اخبار والے اپنے کاروبار چلانے اور اپنے اخبارات فروخت کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ خبر کو جاندار اور اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے معمولی سی خبر کو نمک مرچ لگا کر اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ تہلکہ مچ جائے۔ اسی طرح سیاسی میدان میں جو جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے امیدوار اپنے ووٹرز کو جو سبز باغ دکھاتے ہیں، جو وعدے اور جو دعوے کیے جاتے ہیں وہ منتخب ہونے کے بعد بالکل بھی اس پر پورا نہیں اُترتے اور وہ جھوٹ پر اپنی سیاست کو استوار کرتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے ہاں سیاست ایک ایسا شعبہ ہے کہ جس میں نو آموز سیاست دان یہ سوچ کر بے دریغ پیسہ خرچ کرتا ہے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ اس کے ڈبل ٹرپل بلکہ اس سے بھی زیادہ کمائے گا اور پھر منتخب ہونے کے لئے ان کے جھوٹے دعوے، جھوٹے وعدے جن کے پورا ہونے کا شاید انہیں خود بھی یقین نہیں ہوتا وہ عوام سے کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات لکھنا لازمی سمجھتا ہوں کہ سچ ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں یقیناً اس دنیا میں اچھے لوگ بھی موجود ہیں جو ہمیشہ سچ کے راستے پر گامزن رہتے ہیں وہ سیاست ہو یا زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو۔ بہر حال، ہم بات کر رہے تھے جھوٹ کی۔

اللہ بخشے اپنے اُستادِ محترم راحت اندوری صاحب کو عظیم شاعر گزرے ہیں فرماتے ہیں

دوزخ کے انتظام میں اُلجھا ہے رات دن

دعویٰ یہ کررہا ہے کہ جنت میں جائے گا

قارئین ! کرام دراصل جھوٹ ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے اور شاید اسی کی وجہ سے ہمارا زوال نوشتہ دیوار ہے۔ہمیں ایک قوم ایک معاشرہ ہونے کے ناطے اس خطرناک بیماری سے جان چُھڑانا ہوگی ۔اس عادت کوترک کرنا ہوگا وگرنہ برکت اور رحمت کے سائے ہم سے کوسوں دور چلے جائیں گے اور ہم زوال در زوال کا شکار ہوتے چلے جائیں ۔۔۔

اللہ پاک ہمیں سیدھے راستے پر چلائے آمین۔

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح اب کی چھٹیوں میں بھی دوستوں نے کہیں جانے کا پروگرام بنانا شروع کیا تو مجھے بھی مشاورت میں شامل کیا گیا۔کوئی کہہ رہا تھا کہ فلاں جگہ جایا جائے ،کوئی فلاں جگہ کا کہہ رہا تھا جبکہ کچھ دوست سمندر پر نہانے کا مشورہ دینے لگے ۔میں جو کہ پہلے ہی سمندر کے نام سے خوف کھاتا تھا میں نے صاف انکار کر دیا۔نہیں بھئی میں تو نہیں جاؤں گا لیکن میرے انکار کے باوجود زیادہ تر دوستوں کا سمندر کا ہی پروگرام بن گیا اور پھر مجھے بھی ان کے ساتھ سمندر کنارے جانا پڑا۔

وہ ایک بہت پیاری دوپہر تھی جب ہم سمندر کنارے پہنچے۔ٹھنڈی ٹھنڈی مسحور کن ہوا بہت پیارا ماحول بنا رہی تھی اگرچہ گرمی بہت تھی لیکن پھر بھی چونکہ ہوا چل رہی تھی تو ماحول اچھا تھا ہمارے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ اپنی فیملیوں سمیت آئے ہوئے تھے جن میں نوجوان ، بزرگ اور ہر عمر کی عورتیں اور بچے بھی تھے ۔خیر سب دوستوں نے کنارے پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے لباس تبدیل کیئے کسی نے کچھے پہن لیئے اور کسی نے ٹراؤزر جب کہ میں گھر سے ٹراؤزر لایا تھا لہٰذا میں نے ٹراؤزر پہن لیا۔میں چونکہ بڑے پانی سے ڈرتا تھا اور سمندر کے پانی میں آگے جانے

کے حق میں نہیں تھا لہٰذا کنارے کنارے ہی نہانے لگا دیگر دوستوں نے چھلانگیں لگائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُچھلتے کودتے تھوڑا دور تک چلے گئے۔ میں کنارے کنارے نہاتا رہا اور ماحول کو خوب انجوائے بھی کرتا رہا اچانک میرے دوستوں کی طرف توجہ گئی۔ دوست کسی بات پر زور زور سے قہقے لگا رہے تھے اور ہائے ہائے۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔ ہُو۔۔۔ ہوووو۔۔۔ کا شور برپا کر رہے تھے۔ مجھے بات سمجھ نہ آئی تو میں نے زور سے آواز لگائی کیا ہوا یاروں! ایک دوست نے مجھے واپس جواب دیا اپینٹ پھٹ گئی اس کی۔ میں سمجھ گیا گروپ میں ایک موٹے سے لڑکے کی پینٹ پھٹ گئی تھی یہ بات سُنتے ہی میں بے اختیار ہنس پڑا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا بھینس ہے ناں بھینس۔۔۔

بس یہی کہنا تھا کہ اچانک پٹاخ سے کوئی دو ڈھائی کلو کا ہاتھ میرے کانوں کے پردے چیرتا ہوا مجھے بے ہوش کرنے تک آ گیا۔ میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ سر پر چڑیاں گول دائرے میں اُڑتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے کارٹونوں میں دکھاتے ہیں۔ آنکھوں میں رنگین سپرنگ سے متحرک ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں نے خود کو گرتے ہوئے بمشکل سنبھالا، بے ہوشی سی طاری ہوگئی اور پھر جب میں نے ہوش سنبھال کے دیکھا تو میرے قریب ہی کھڑی ہوئی موٹی سی بھینس نما خاتون گیلے کپڑوں میں ملبوس مجھے کہہ رہی تھی بدتمیز کہیں کا پھر کہے گا مجھے بھینس۔

☆☆☆

تیرے خوابوں پہ نچھاور

ہر وقت ہر لمحہ لڑتے رہنے والی، شوہر کو غربت کے طعنے دینے والی، آج انتہائی خوش تھی اور خوش کیوں نہ ہوتی آج اُس کے خواب پورے ہو گئے تھے وہ جس چیز کی اپنے شوہر سے فرمائش کرتی رہتی تھی، جس چیز کے لیے لڑتی رہتی تھی آج اسے اچانک اُس کے شوہر نے نہ جانے کہاں سے لا کر دے دی حالانکہ حالات کافی دنوں سے ابتر تھے، خواہشات کی تکمیل تو دور کی بات، دو وقت کا کھانا تک مشکل تھا مگر حیرت کی انتہا تھی کہ اُس کے شوہر نے دو تین گفٹ پیک لا کر اُس کی جھولی میں ڈال دیئے اور اس پر انکشاف کیا کہ آج اس کی سالگرہ ہے وہ خوشی سی پھولے نہیں سما رہی تھی وہ گفٹ کھول کر دیکھ چکی اُس کے خواہشات کے مطابق انتہائی مہنگے تحائف حاضر تھے۔

یہ سب کہاں سے آئے؟ اس کے ذہن میں سوال اُٹھا۔ گزشتہ دو تین ماہ سے بے روزگار رہنے والا شوہر، دو وقت کی روٹی مشکل سے کما کر لانے والا، آج یہ سب کہاں سے لے کر آ گیا بہر حال اُس کو اِس سے کیا۔ گھوڑے کو گھاس سے مطلب ہے وہ بہت خوش ہوئی وہ سوچ رہی تھی کہ خواہ مخواہ ہی وہ اس سے لڑتی رہتی ہے دیکھو وہ کس طرح اُسکے لیے تحائف لے کر آ گیا اب معاشرے میں عزت بنے گی ہمسائیاں اور تمام ہم عمر دیکھ لیں گی کہ میں بھی یہ چیزیں پہن سکتی ہوں۔ میرے پاس بھی تمام چیزیں موجود ہیں مگر یہ سب آئی کہاں سے؟ وہ بار بار سوچ رہی تھی کوئی

خدشہ اُس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا اتنا پیسہ اچانک کہاں سے لے آیا میرا شوہر؟ یقیناً آج آئے گا تو میں لازم اُسے پوچھوں گی۔

بالکل ویسے ہی ہوا۔ شوہر جب شام کو کام سے گھر واپس آیا تو آتے ہی بیگم نے سوال کر ڈالا۔۔۔ جانم یہ سب کہاں سے لے کر آئے تھے؟ اتنے پیسے کہاں سے دستیاب ہوئے؟ تمہاری تو ٹھیک سے نوکری بھی نہیں ہے؟ کھانا مشکل سے تیار ہوتا ہے پھر یہ سب کچھ؟ کہاں سے آیا یہ سب؟ شوہر خاموش رہا اور کمرے میں جا کر سو گیا شاید بہت تھکا ہوا تھا جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

وہ قریب گئی، شوہر کی قمیص کروٹ بدلنے کے باعث پیٹ سے ہٹی ہوئی تھی۔ اُس نے دیکھا پیٹ پر چیر کے نشانات۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ گردہ۔۔۔ یقیناً اُس نے اپنا گردہ بیچ دیا تھا۔

☆☆☆

افسوس صد افسوس یہ دیکھ کر کہ آج وہی نوجوان لڑکا جو کل میں نے ایک جگہ پر دیکھا کہ وہ اپنی ٹانگوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا اور بھیک مانگ رہا تھا اپنی ناکارہ ٹانگیں دکھا کر، وہ بس سٹینڈ کے اڈے پر اُترا اور بالکل ٹھیک تھا اپنی ٹانگوں پر چل رہا تھا پھر میں نے اُس کا تھوڑا سا تعاقب کیا تو وہ ایک گلی کے سنسان جگہ پر جا کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ویسے ہی اپنی ٹانگوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھیک مانگتے ہوئے چلنے لگا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر راہ چلتی عورتیں اور دیگر حضرات اُس کی جھولی میں پیسے ڈالتے ہوئے گزرنے لگے۔

مجھے اُس شخص پر انتہائی غصہ آیا کہ یہ کیا ہے۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے پھر بھی یہ بھیک مانگ رہا ہے۔ اسے ذرا برابر بھی شرم نہیں آ رہی۔ کیسے لوگ ہیں زمانے میں کوئی لنگڑا بنا ہوا ہے تو کوئی اندھا بہرا، حد ہے شرم حیا، غیرت، خودداری تو جیسے اُٹھ گئی ہو زمانے سے، پھر میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ بابا عمر تقریباً ساٹھ ستر کے لگ بھگ، جُھکی کمر، بمشکل سبزی کی ریہڑھی کو دھکیل رہا ہے، ریہڑھی پر تھوڑی تھوڑی مختلف سبزیاں رکھی ہوئی تھی اور وہ محنت کر رہا ہے لیکن بھیک نہیں مانگ رہا تھا حالانکہ وہ اپنی بزرگی، ضعیفی کا بہانہ بنا کر بھیک مانگتا تو وہ کافی کما سکتا تھا مگر شاید اُس کی غیرت نے اُسے ایسا کرنے سے روکا ہوا تھا۔ سخت گرمی میں دھوپ پر وہ بزرگ ریہڑھی دھکیل رہا تھا پھر

میں نے دیکھا کہ اُس کی چھوٹی سی بچی بھی اُس کے ساتھ ریہڑھی دھکیل رہی تھی وہ بچی جسے سکول جانا چاہیے اپنے بوڑھے، دادا یا شاید نانا کے ساتھ اپنے گھر کی گاڑی کھینچنے کے لیے اس سبزی کی ریہڑھی کو دھکیلنے میں دادا کی مدد کر رہی تھی۔

میں نے سوچا معاشرہ ایسے بزرگ، غریب، اور کمزور طبقے کی مدد کرنے پر تو آمادہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص مصنوعی معذوری ظاہر کر کے بھیک مانگ رہا ہے اُس کو دھڑا دھڑا پیسے جھولی میں ڈالے چلے جا رہے ہیں۔

کیوں معاشرہ ایسے مصنوعی، پروفیشنل مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا؟

کیوں ایسے بزرگ، خوددار انسانوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی؟

آخر کون اس نظام کو درست کرے گا؟

آخر کون معاشرے سے گداگری کی لعنت کو ختم کرے گا؟

☆☆☆

بیس سال کی خوبرو نوجوان قابل پڑھاکوں، تعلیمی میدان میں ہر بار اول آنے والی اعلی صفات کی حامل، باحیا باوقار اور معصوم لڑکی ہمیشہ اپنی کلاس فیلوز کے غم میں برابر شریک رہنے والی، ہنس مکھ نرم دل لڑکی۔ آج اُس کے بارے سُنا تو میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ بھلا اُس بیچاری نے کسی کا کیا بگاڑا تھا وہ تو یونیورسٹی میں تمام لڑکیوں سے بنا کر رکھتی تھی، دردمند دل رکھنے والی یہ لڑکی ہر کسی کی مدد کرتی خود اپنے کام چھوڑ کے دوسری لڑکیوں کے کام آتی مگر نہ جانے کیوں اُس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ یہ بے رحم زمانہ ہے ذرا کسی کو بلندی کی طرف گامزن ہوتے دیکھا تو اس کی ٹانگیں کھینچنے پر اُتر آتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ہمارا معاشرہ کچھ اس طرح کا ہی ہے دلوں میں نفرت، بغض، اور کھوٹ بھرا ہوا ہے، ایک سے ایک بڑھ کر ظالم جذبات رکھنے والے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔

ہوا یوں کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی مہر ماہ نے ہماری پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور تمام یونیورسٹی میں اس کے نام کے گُن گائے جانے لگے۔ لڑکیاں اور دیگر اُستانیاں اُس کی دیوانی ہونے لگیں اور یونیورسٹی کی سالانہ تقریب میں بھی اُسے اولیت دی گئی اور بہت سے انعامات سے نوازا گیا۔ تمام یونیورسٹی سٹاف اُس کو اپنا اعزاز سمجھنے لگے کہ ایسی محنتی اور ذہین لڑکی ہماری یونیورسٹی

کی سٹوڈنٹ ہے۔

سب کچھ ٹھیک تھا مگر پھر وہی بات یہ جہاں پوری یونیورسٹی اس لڑکی کو اپنا اعزاز سمجھ رہی تھی وہیں چند ایک ایسی سٹوڈنٹس بھی تھیں جو جلن کے مارے مری جا رہی تھیں حسد کی آگ اُن کے دلوں کو چیر رہی تھی اور وہ آپ میں مہر ماہ کی اتنی زیادہ پزیرائی پر آگ بگولا تھیں وہ مہر ماہ کی روز روز کی بڑھتی ہوئی شہرت کا سُن سُن کر انتہائی سیخ پا تھیں۔ اُنہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے اسے نیچا دکھا سکیں اور اپنی اَنا کو تسکین پہنچا سکیں۔ بالآخر اُنہوں نے ایک ایسا پلان بنایا کہ جس سے مہر ماہ بدنام ہو کر رہ گئی۔ اُس کی ساری شہرت ساری نیک نامی ساری محنت خاک ہو کر رہ گئی۔

ہوا یوں کہ ان حاسد لڑکیوں نے اگلے سہ ماہی ٹیسٹ کے سے پہلے کسی طریقے سے ہونے والے پیپرز چوری کر لیے اور موقع پا کر اُنہیں مہر ماہ کے پرس میں ڈال دیئے۔ مہر ماہ اس تمام واقعے سے بے خبر رہی۔ بعد میں ان لڑکیوں نے پیپر ہونے سے محض تھوڑی دیر پہلے پیپرز چوری ہونے اور آؤٹ ہونے کا شور مچا دیا۔ بس پھر کیا تھا ابھی پیپر تقسیم نہیں کیا گیا تھا اور پیپر چوری ہونے کی اطلاع پا کر تحقیقات شروع ہوئیں اور تمام لڑکیوں کے بیگ و پرس کی تلاشی لی گئی۔ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی مہر ماہ کے پرس سے وہی پیپرز برآمد ہو گئے۔ مہر ماہ جسے اس بات کا گمان تک نہ تھا وہ اس اچانک الزام سے ہکا بکا رہ گئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا پیپرز برآمد ہو چکے تھے۔ اسے پرنسپل کے پاس طلب کر لیا گیا۔ آج کا پیپر کینسل کر دیا گیا اُسے بری طرح سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اُس کے پچھلی شاندار کامیابی کو بھی داغدار کر دیا گیا اور یہاں تک کہا گیا کہ تم نے پہلے بھی ایسے ہی کامیابیاں حاصل کی تھی۔

بات یونیورسٹی سے باہر نکلی۔ یونیورسٹی میں اُسے چور کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا اور بعد میں یونیورسٹی کی بدنامی کے ڈر سے اُسے یونیورسٹی سے ہی نکال دیا گیا۔ ایسی شریف لڑکی جس پر سب کو ناز تھا آج وہ بدنام ہو کر رہ گئی چند شر پسند اور حاسد لڑکیوں کے شر کی وجہ سے اُس کی زندگی

برباد ہو گئی اور وہ اپنی بربادی کو اپنی بدنامی کو برداشت نہ کر سکی اور آخر ایک دن وہ دوبارہ یونیورسٹی پہنچی اُسے دیکھ کر تمام لڑکیاں اُسے چور کہہ کر پکارتی رہیں اور کہتی رہیں۔

" اری چورنی تم پھر کوئی نیا ڈرامہ رچانے یہاں آ گئی ہو، کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہیں پھر سے داخلہ مل جائے گا"۔

مگر انہیں کیا معلوم وہ داخلہ لینے نہیں آئی۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے سیدھی دوسری منزل پر پہنچی اور وہاں جا کر بغیر رُکے سیدھا چھت سے چھلانگ لگا دی اور وہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔

پیچھے اُس کے پڑ گئے کیونکر سارے لوگ
کینہ پرور، بغضی، حسد کے مارے لوگ

☆☆☆

ادھورے خواب

آکاش آج بہت خوش تھا اور خوش ہوتا بھی کیوں نہ۔ آج اُس کی اُمیدیں بر آنے کا دن تھا اُس نے جو بڑے بڑے خواب دیکھے تھے آج وہ پورے ہو گئے تھے جی ہاں آج اُس کی ڈگری مکمل ہو گئی تھی اور اب وہ پریکٹیکل زندگی میں قدم رکھنے لگا تھا۔ اُس کے گھر والے ماں باپ اور بہنیں سارے جو اُس دن کے منتظر تھے آج بہت خوش تھے۔ سب نے اُس سے آس لگا رکھی تھی۔

آکاش چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا ماں باپ کا ایک بیٹا، اُن کا نورِ نظر اُن کی اُمیدوں کا محور۔ سب کی نظریں آکاش پر لگی تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر اور اپنی تعلیم مکمل کر کے انشاء اللہ بڑا افسر بنے گا اور اپنے گھر، ماں باپ اور بہنوں کے خواب پورے کرے گا۔ وہ خواب جو اُنھوں نے غریبی، محرومی کی حالت میں دیکھے تھے۔

آکاش نہایت قابل انسان، ماں باپ کا فرمانبردار اور اپنی بہنوں سے بے حد پیار کرنے والا انتہائی نیک لڑکا تھا، اُس کو ڈگری مل چکی تھی، وہ ابھی اور بھی پڑھنا چاہتا تھا مگر حالات ایسے تھے کہ جاب لازمی تھی اسی لیے اُس نے مختلف اداروں، کمپنیوں اور دفاتر میں جا جا کر اپنی سی ویاں جمع کرا رکھی تھیں۔ وہ کافی پُراُمید تھا کہ کہیں نہ کہیں اُس کی جاب لگ جائے گی۔ کیوں کہ اُس

کے پاس کیا نہیں تھا، ڈگریاں مکمل ہو چکی تھیں اور وہ ویسے بھی ایک ایسا انتہائی قابل اور محنتی نوجوان تھا کہ جس کی ہمیشہ قدر کی جانی چاہیے تھی مگر سی ویاں جمع کرانے کے کافی دنوں بعد تک بھی اُسے کسی جگہ سے انٹرویو کی کال نہ آئی۔ اب اُس نے مزید انتظار کرنا بے سود جانا اور دوبارہ اُنہیں دفاتر کے چکر لگا کر معلومات حاصل کیں کہ اُس کی سی ویوں کا کیا بنا۔ اسی اثناء میں اسے ایک دو جگہوں سے انٹرویو پر بُلا لیا گیا وہ بہت خوش ہوا اور خوشی خوشی انٹرویو دینے پہنچا۔ بظاہر تو انٹرویو میں کامیاب رہا اتنے رش کے باوجود اُس کی تعلیم اور اُس کی قابلیت کو سراہا گیا اور کال لیٹر کے انتظار کا کہا گیا پھر ایک عرصہ گزر گیا اور کہیں سے بھی اُسے نہیں بلایا گیا، کہیں سے کال نہ آئی۔ اُس کے انتظار کے حد ہو گئی تو وہ ایک مرتبہ پھر اُن دفاتر کا چکر لگانے جا پہنچا۔

ایک دفتر میں گیا تو جواب ملا، کون سا انٹرویو؟ کب کی بات ہے؟ ارے وہ۔۔۔۔۔ وہ تو بندے سلیکٹ بھی ہو گئے اور وہ کام بھی کر رہے ہیں آپ شاید بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ جایئے کہیں اور جاب تلاش کریں۔ دوسرے دفاتر میں بھی کچھ ایسا ہی جواب ملا گو یا اُسے جواب دے دیا گیا تھا وہ بہت حیران ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے کال لیٹر کی تسلیاں دی گئی تھیں پھر یہ کیسے ہو گیا؟ بندے بھی رکھ لیے گئے۔ مجھ میں کیا کمی تھی؟ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس نے تو کسی کو ایک پائی بھی نہیں ادا کی، نہ کوئی سفارش تھی اُس کے پاس، پھر وہ کیسے جاب پر لگ سکتا تھا، بغیر سفارش کے، بغیر رشوت کے، کیسے؟ وہ سر جھکائے سڑک پر گھر کی جانب گامزن تھا۔

وہ بہت غمناک ہو چکا تھا۔ مایوسی کی چادر اوڑھے تقریباً لڑکھڑانے کے انداز میں چلتا جا رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر والے اُس کی جاب کی خوش خبری سُننے کے منتظر تھے وہ کہہ کر آیا تھا کہ واپسی پر مٹھائی لے کر آؤں گا ماں باپ منتظر ہوں گے، بہنیں راہ دیکھتی ہوں گی، آج سب مسائل کا حل نکلنے کا دن تھا ان کے لیے، مگر وہ تو ناکام ہو چکا تھا، معاشرے کے اوچھے ہتھکنڈوں کے ہاتھوں، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ گھر پہنچ گیا۔ گھر والے خالی ہاتھ اور لٹکا ہوا منہ دیکھ کر سمجھ گئے۔ بہنیں ہمدردی کرنے لگیں۔ ماں باپ نے تسلی دی کہ شاید کچھ دنوں تک کہیں اور جاب لگ جائے گی مگر ہفتے، مہینے گزرے پھر سال گزر گیا مگر بے روزگاری نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اُس کے پاس کوئی پیسے تک نہ تھے کہ کوئی کاروبار کرسکتا کوئی سفارش نہ تھی کہ کہیں نوکری لگ جاتی کوئی رشوت نہ تھی کہ کسی بڑے افسر کو دے کر جاب لگتی اُس کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ اس کی زندگی کا اثاثہ تعلیم تھی، ڈگریاں تھیں مگر یہاں ڈگریوں کو کون دیکھتا ہے تعلیم کو کون پہچانتا ہے یہاں تو رشوت چلتی ہے سفارش چلتی ہے اور وہ اُس کے پاس نہیں تھی۔

وہ انتہائی نا اُمید ہو چکا تھا ہمہ وقت سوچ میں ڈوبا رہتا تھا وہ ماں باپ اور بہنوں کے کچھ کام نہ آسکا بس یہی سوچتا ہوا پریشان، غمگین، ایک دن سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ اچانک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی اُس پر چڑھ دوڑی۔ وہ ٹھوکر لگنے سے دور جا گرا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے مجمع لگ چکا تھا وہ فٹ پاتھ پر بے سُدھ پڑا تھا، خون میں لت پت، پھر ایک بزرگ آدمی نے آگے بڑھ کر اُسے چیک کیا نبض نہیں چل رہی تھی، دل کی دھڑکن نہیں تھی، کوئی حرکت نہیں تھی، وہ بے اختیار بول اُٹھا۔۔۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

☆☆☆

انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ ہر بہتر و خوب تر چیز خود حاصل کرنا چاہتا ہے جب کہ کم تر و بدتر دوسرے کے پاس دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی اچھی چیز کسی اور کے پاس نظر آجائے تو اُسے شدید کوفت ہوتی ہے اور وہ حاسد بن جاتا ہے اور وہ اُس چیز کو خراب کرنے ضائع کرنے نیز اُس شخص کو بدنام کرنے تکلیف پہنچانے اور اُس چیز کو حاصل کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اُسے یہ ملال ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کو کیوں مل گئی جب کہ وہ اس کا اہل نہیں اصل و بہتر حق دار "میں" ہوں مجھے کیوں نہیں ملی۔ وہ خود سے بہتر کسی اور کو نہ سمجھتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ میں ہی سب سے بہتر و اہم ہوں۔ ہر چیز صرف میری ملکیت میرے اختیار میرے تصرف اور بلا شرکتِ غیر صرف میری ہی ہونی چاہیے۔ ہر جگہ میرے ہی چرچے ہوں اور ہر جگہ میرا نام لیا جائے سب میرے مطیع ہوں سب میرے ہی آگے جھکیں، میرے ہی گُن گائیں میری مدح و توصیف بیان کریں کسی اور کے لیے کبھی کسی طور رطب اللسان نہ ہو۔ انسان اپنے مفاد خواہش لامتناہی و نا تمام کے تکمیل کی خاطر مجرمانہ یا غیر اخلاقی یا کچھ بھی کرسکتا ہے۔ وہ اس کی خاطر جان لے بھی سکتا ہے اور دے بھی سکتا ہے۔

انسان خود کو سب سے بڑا، بہادر، سمجھ دار، طاقتور مانتا اور گردانے لگتا ہے۔ وہ اپنی

طاقت کے نشے میں ہوتا ہے اور اس طاقت کے نشے میں وہ کبھی ہار تسلیم نہیں کرتا، جس کی وجہ سے وہ اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے ہر حد پار کر لیتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ دھوکا، فریب مکاری، جبر، ظلم، ناانصافی، بیوفائی کرتا ہے کیونکہ وہ خواہش کا غلام بن چکا ہوتا ہے۔

یہ غلامی اُس کے اندر بلا کی بے حسی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بے حس ہو کر ہر اچھے جذبے کو روندتا چلا جاتا ہے اور اپنے آپ کو اور اپنی آخرت کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر لیتا ہے۔ انسان نے خود اپنے کرتُوتوں سے اپنا مقام گرا دیا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہو کر بھی اُس کی لاج نہیں رکھ پایا۔ اپنے رُتبے کو برقرار نہیں رکھ پایا۔ انسان اپنے مقام سے اتنا گر چکا ہے کہ جب کبھی کوئی وفاداری کی بات کرتا ہے تو کتے کی وفاداری کی مثال دیتا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اتنا گر گیا ہے کہ اُس سے زیادہ وفا کتے میں ہے وفا کے معاملے میں وہ کتوں سے بھی پیچھے رہ گیا ہے اور اُس کی اسی بے وفائی کی اصل وجہ اُس کی دنیا داری، غرور، تکبر اور دنیا سے شدید محبت ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہ کسی کا خیال رکھتا ہے اور نہ پھر وہ کسی کے مروت پیار و لحاظ میں نیچے جھکتا ہے بلکہ اُس کو دنیا کا حرص ہوس اندھا کر دیتا ہے اور وہ اسی حرص میں سب کے ساتھ وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو کسی طور مناسب و اچھا نہیں ہوتا، اور اسی دنیا کی محبت اور اس کے نشے میں غارت رہتا ہیں۔ پھر یہی لالچ اُسے لے ڈوبتا ہے۔

انسان بے وفا، بے حس، مطلب پرست، دنیا دار، ظالم، ناشکرا، دغا باز، احسان فراموش، لالچی، جھوٹا، حاسد اور سب سے بڑا احمق ہیں یہی ایک تلخ اور اٹل حقیقت ہے۔ جو کوئی سُننا اور تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتا۔

☆☆☆

مبشر اپنی مرسڈیز بڑے احتیاط اور باوقار طریقے سے چلاتا ہوا مین شاہراہ سے جونہی چوک کی طرف مڑا اچانک اُس کی گاڑی کسی اور گاڑی سے جا ٹکرائی اور پھر کیا تھا وہ گاڑی والا اُتر کر مبشر کی جانب بڑھا اور اُسے گالیاں دینے لگا۔

گالیوں کی آواز سُن کر مبشر خیالوں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ پٹرول پمپ پر کسی شخص کی مرسڈیز گاڑی کے شیشے صاف کر رہا ہے اور اس کی کلائی کی گھڑی سے اس کے شیشے پر ہلکا سے نشان پڑ گیا، اسی بناء پر اس گاڑی کا مالک اُس پر برسنے لگا۔ مبشر نے فوراً اپنی قمیض کے بازو سے رگڑ والی جگہ کو صاف کرنا شروع کیا۔

گاڑی کا مالک کہہ رہا تھا۔۔۔نون سینس، بلڈی فول، اناڑی کہیں کا۔ جب کام ہی نہیں آتا تو کیوں آتے ہو دوسروں کے کام خراب کرنے؟ پھر اُس نے مبشر کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ایک سائیڈ پر کھڑا کر دیا، وہ شخص بڑے غصے میں اپنی گاڑی نکال کر چلتا بنا اور مبشر کو اس کا معاوضہ بھی نہ دیا۔ مبشر بہت سٹپٹا گیا، پریشانی میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ کیا اس کے مقدر میں یہی لکھا تھا، گالی گلوچ سہنا، دھکے سہنا، اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی یہی کام ملنا تھا تو پھر کیوں پڑھا میں؟ ڈگریاں کیوں حاصل کیں؟ مبشر

جوتعلیم یافتہ لڑکا تھا اور ابھی آگے پڑھنا چاہتا تھا لیکن غربت، کسمپرسی اور اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے آگے نہ پڑھ سکا تھا بہت تلاش بسیار کے بعد بھی اسے کوئی نوکری نہ مل سکی تو وہ اپنے گھر کی روزی روٹی کے لیے یہاں پٹرول پمپ پر آ گیا اور وہاں آنے والی گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے لگا اس کے بدلے میں گاڑیوں کے مالک اسے کچھ نہ کچھ ٹپ لازمی دے کر جاتے اور اس طرح اس کا گزارا بمشکل چل رہا تھا لیکن وہ اس قلیل کمائی سے اپنی تعلیم مزید جاری نہیں رکھ سکتا تھا بعض گاڑیوں والے اچھے بھی ہوتے اور زیادہ پیسے دے جاتے لیکن بعض ایسے گھٹیا طبیعت کے مالک بھی ہوتے جو اسے گالیاں دیتے اور معاوضہ بھی نہیں دیتے تھے۔

آج اس واقعے نے اسے کافی غمزدہ اور افسردہ کر دیا تھا اور غمزدہ ہوتا بھی کیوں نہ، جب وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر کام کرے گا اس کے دن سنور جائیں گے، حالات بہتر ہو جائیں گے، گھر میں رزق کی فراوانی ہوگی، بیمار ماں کا علاج کرنے کے لیے پیسے ہوں گے اور ماں ٹھیک ہو جائے گی، بہن کی شادی بھی اس نے کرانی تھی، اُس کا جہیز بھی بنانا تھا لیکن اس سب کے لیے اسے کافی محنت کرنی تھی کسی مقام پر پہنچنا تھا اور کسی اچھے مقام پر پہنچنے کے لیے پڑھنا شرط تھا اور وہ پڑھ رہا تھا گھر کے نامساعد حالات کے باوجود بھی وہ سوچتا تھا کہ اس کے باپ کی کوئی جائیداد نہیں، کوئی زمین نہیں، اپنا مکان تک نہیں بلکہ کرائے کے مکان میں زندگی گزر رہی تھی، اس کے عزائم تھے کہ پڑھ لکھ کر وہ ضرور امیر ہو جائے گا اس کی نوکری لگ جائے گی اور پھر وہ اپنا گھر بھی بنا لے گا اور تمام مسائل حل ہو جائیں گے لیکن کچھ بھی نہ ہوا اتنا پڑھنے کے بعد بھی اس کو کوئی جاب نہ مل سکی وہ مزید پڑھ بھی نہ سکا۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کی بھاری بھرکم فیسیں ادا کرنا اب اس کے بس میں نہیں تھا اور وہ آج اس پٹرول پمپ پر گاڑیاں صاف کرنے کے دھندے پر لگا ہوا ہے مانا کہ محنت مزدوری میں کوئی طعنہ نہیں لیکن یہ زمانے والے یہ یار دوست لوگ اسے جب دیکھتے تھے تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے۔ رشتہ دار

جب کوئی اس پٹرول پمپ پر تیل بھروانے آتا تو اُس کے سامنے مبشر کو خاصا ذلیل ہونا پڑتا، عجیب عجیب نگاہوں کو برداشت کرنا پڑتا اور پھر وہ رشتہ دار یا دوست احباب اس سے دور دور رہتے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کا دوست، ان کا رشتہ دار پٹرول پمپ پر گاڑیاں صاف کر رہا ہے۔

جی ہاں اُلٹی گنگا بہنے لگی تھی بجائے اس کے کہ اس کی محنت کی تعریف کی جاتی اس کی غربت میں اس کے دوست رشتہ دار اس کا سہارا بنتے اُلٹا اسے برا سمجھنے لگے تھے وہ سوچوں میں گم تھا کہ اچانک آواز آئی۔۔۔چل بھئی ادھر آ۔۔۔۔۔گاڑی کے شیشے دھو دے۔

☆☆☆

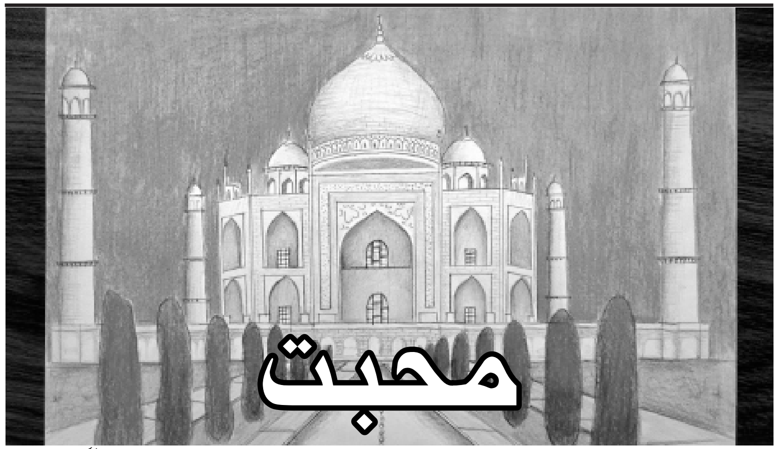

لفظ محبت سنتے ہی ایک خوشگوار سا احساس جنم لیتا ہے۔ فضائیں معطر لگنے لگتی ہیں۔ مناظر حسین لگنے لگتے ہیں اور سنجیدہ چہرے مسکرا اُٹھتے ہیں مگر اس کے برعکس کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو محبت کا نام سُنتے ہی کانپ اٹھتے ہیں، ڈسٹرب ہوجاتے ہیں، طبیعت میں اچانک چڑ چڑا پن آجاتا ہے، اچھا خاصہ ٹھیک موڈ خراب ہوجاتا ہے، شاید اُن کا وہ احساس زندہ ہوجاتا ہے جسے بھلانے میں کافی وقت لگ چکا ہوتا ہے۔ یقیناً کچھ تو ایسا ہوا ہوگا اُن کے ساتھ کہ محبت پر سے اُن کا اعتماد اُٹھ گیا، جتنے لوگ اتنی باتیں، جتنے انسان اتنے رویے، کسی کو محبت راس آگئی تو کسی کو محبت نے توڑ کر رکھ دیا۔

محبت کیا ہے؟ اللہ کی محبت مخلوق سے، ماں باپ کی بچے سے محبت، بہن بھائی کی محبت، بھائیوں کی آپس میں محبت، فطرت سے محبت، ماحول سے محبت، نظاروں سے محبت، اپنے پالتو جانور سے محبت غرض محبت کے سینکڑوں زاویے ہیں، لفظ محبت کو ہر طبقے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

محبت سچے جذبوں، خلوص اور پیار کا دوسرا نام ہے۔ محبت جب دو دلوں کے درمیان ہوتا ہے تو عشق جنم لیتا ہے ایک دوسرے سے کبھی نہ جدا ہونے کے عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ ایک

دوسرے پر مر مٹنے کے وعدے ہوتے ہیں اور پھر اُن دو دلوں میں سے کسی بھی ایک کی ذرا سی لغزش، ذرا سی بے وفائی، دوسرے کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔

ازل سے محبت کی داستانیں زندہ ہیں اور ہمیشہ محبت کا یہی دستور رہا ہے کہ محبت کرنے والے سے لوگ نالاں ہی نظر آتے ہیں تاریخ پیار محبت اور عشق کے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہیر رانجھا، لیلا مجنوں، سسی پنوں، شیریں فرہاد جیسے سچے عاشق، آج بھی کہانیوں، قصوں میں زندہ ہیں محبت کا آج بھی یہی دستور اور یہی تیور ہے جو ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا۔

محبت پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی، ہزاروں داستانیں مشہور ہوئی، ہر علاقے، ہر معاشرے، ہر خطے کی اپنی داستانیں مشہور ہیں مگر میں نے جس چیز پر غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ محبت میں ذرا سی بے وفائی ناقابل برداشت امر ہے۔ ہجر، فراق، جدائی، حتیٰ کہ موت انجام ہوتی ہے۔ شاعر، پیار، محبت، عشق کو اپنے الفاظوں میں بیان کرتا ہے کسی شاعر کا شعر ہے۔

پیار محبت، ہوش حواس کا نام نہیں
تجھ کو بھی یہ شوق اگر ہے، پاگل ہے

یقیناً شاعر اپنے احساسات، اپنے تجربات، اور اپنے نظریات کی بنیاد پر بات کرتا ہے شاعر کی نظر میں عشق محبت ہوش حواس والوں کا کام نہیں اُس کی نظر میں کوئی پاگل ہی ہوگا جو عشق کی طرف مائل ہوا۔

محبت اگر یک طرفہ ہو تو معاملہ کافی دلچسپ بن جاتا ہے۔ بس اِس طرف سے تو محبت کے جذبات ہوگے مگر اُدھر سے کچھ بھی جواب موصول نہ ہوگا، اور پھر اگر محبت کا اقرار دونوں جانب سے نہ ہوا اور دل ہی دل میں محبت کا پودا جوان ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں محبوب شخصیت کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ فلاں شخص اُس سے محبت کرتا ہے اور وہ ہے کہ اُس کے غم میں تڑپتا رہتا ہے۔

سچی محبت کرنے والے کی اصل پہچان یہی ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ محبوب کا ملنا نہ

صرف مشکل ہے بلکہ اکثر اوقات ناممکن بھی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ محبت کیے جاتا ہے اور اس معاملے میں تمام عمر انتظار کو بھی خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے نام میرے دو شعر۔۔۔

چاہتوں کے امین ہیں عاشق
یار کتنے ذہین ہیں عاشق
انکے قصے تو اب بھی زندہ ہیں
خود جو زیرِ زمین ہیں عاشق

☆☆☆

مصطفیٰ ایک انتہائی ہنس مکھ اور خوش طبیعت نوجوان تھا۔ میں جب بھی اُس سے ملتا، دل چاہتا کہ بس اُس کے پاس ہی بیٹھا رہوں یا وہ میرے پاس بیٹھا رہے یہ خواہش صرف میری ہی نہیں تھی بلکہ محلے کے ہر اُس شخص کی تھی جو اُس سے میل جول رکھتا تھا۔ ہمیشہ ہنسی مذاق کرنے والا انسان دوسروں کو ہنسا ہنسا کر خوش کر دینے والا زندہ دل خوش سیرت، خوش صورت، اور اُس کا ہنسی مذاق ایسا کہ کسی کی تضحیک بھی نہ ہو۔ ہمیشہ دوسرے کی عزت کرنے والا نوجوان اُسے دیکھ کر ہی دل خوش ہو جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ ساری دنیا کی خوشیاں اُس کے پاس ہیں اُس کو کوئی غم نہیں، ہمیشہ خوش رہنے والا نوجوان ہر کسی کی تمنا کہ ایسی خوشی ایسی پیاری طبیعت اللہ پاک ہر کسی کو نصیب فرمائے۔

میں جب اُس سے آخری بار ملا تو وہ دوستوں کے گروہ میں بیٹھا سب کو ہنسا ہنسا کر پاگل کئے جا رہا تھا۔ مجھے کچھ عرصے کے لیے دوسرے شہر جانا پڑا اس دوران میرا اپنے علاقے سے رابطہ زیادہ نہ رہا مصروفیت کے دن نجانے کیسے گزرے چار پانچ ماہ ہو گئے پھر جب میں واپس آیا تو محلے میں وہ پہلے جیسی گہما گہمی نظر نہ آئی۔ نوجوانوں کے گروہ تو موجود تھے مگر وہ ہنسی مذاق وہ قہقہے نظر نہ آئے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ خوش طبیعت نوجوان مصطفیٰ موجود

نہیں ہے۔ استفسار کرنے پر جو بات معلوم ہوئی اس سے میرے دل کو ایک شاک سا لگا۔ دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ مصطفیٰ فوت ہو چکا ہے۔ اتنا زندہ دل انسان کیسے فوت ہو سکتا ہے اُسے تو کوئی غم ہی نہیں تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ بس خوشیاں ہی ہیں اُس کے مقدر میں اور وہ سب میں خوشیاں بانٹتا رہتا تھا۔ لیکن یہ کیا۔ مصطفیٰ فوت ہو گیا؟

کیوں؟

کس طرح؟

کیا ہوا بیچارے کو؟

میرے دل میں یک دم کئی سوالات نے جنم لیا۔

بتانے والوں نے بتایا کہ تقریباً دو ماہ قبل ہی وہ فوت ہو گیا تھا۔ ایک دن اچانک اُس کی طبیعت خراب ہوئی تو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے لیور فیل ہو چکے ہیں اور اب اس کے پاس زندگی کے زیادہ دن نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس کے لیور اب نہیں کافی عرصے سے خراب چلے آ رہے تھے اور پھر ایک دن وہ فوت ہو گیا۔ اتنا کچھ سُننے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کے ماں باپ کے پاس جا کر افسوس کروں اور اُن کا غم بٹاؤں۔

میں نے جب چھان بین کی تو پتہ چلا کہ اس نوجوان مصطفیٰ کے اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اُس کے ماں باپ، بہن بھائی یعنی پوری فیملی ٹرین حادثے میں دو تین سال پہلے ہی وفات پا چکے ہیں اور اب وہ اکیلا تھا۔

میں بہت حیران ہوا کہ یہ بات مجھے کیوں معلوم نہ تھی جب کہ وہ ہمارے پڑوس کے محلے کا رہائشی تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صرف مجھے ہی نہیں اکثر لوگ اس کی کہانی سے لاعلم تھے سب ہی اُسے ہنس مکھ اور محفلوں کی جان کے حوالے سے جانتے تھے۔ مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اتنا

ہنسانے والا، اتنا خوش رہنے والا وہ نوجوان اپنے اندر غم کا سمندر لیے جی رہا تھا۔ اُس نے آج تک کسی کو محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ اس دنیا میں اس قدر اکیلا ہے۔ اُس نے اپنے غم کو اپنے سینے میں ہی دفن کیے رکھا اُس کی زندگی میں غموں کے پہاڑ موجود تھے۔ اُس کی زندگی ماں باپ کے بغیر تھی۔ اُس کی زندگی بہن بھائیوں اور ماں باپ کے صدمے کو سہتے ہوئے گذری۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا اندر ختم ہو چکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سے مر چکا تھا مگر اُس نے یہ بات کسی پر عیاں نہ کی۔ وہ ہمیشہ اداکاری کرتا رہا۔ خوش رہنے کی۔ خوشیاں بانٹنے کی اداکاری۔

ہنسنے کی اداکاری یہ کرتے ہوئے چہرے
اندر سے ہیں غمگین یہ ہنستے ہوئے چہرے

☆☆☆

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

ایک مرتبہ مجھے اپنے دوست الیاس سے ملنے سنٹرل جیل جانا پڑا جہاں وہ ایک پولیس مین کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ مجھے جیل دکھانے کے لیے جیل کے اندر لے گیا وہاں بہت سے لوگ قیدی وردیوں میں مختلف کاموں میں مصروف تھے بہت سے قیدی مشقت والا کام بھی کر رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ وہاں کچھ بزرگ افراد بھی تھے لگ بھگ ساٹھ ستر برس کی عمر والے اور کئی ایسے کمزور اور لاغر بھی تھے کہ اپنی جُھکی کمر اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ جیل کے مختلف حصوں میں جھاڑو لگا رہے تھے مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکا کہ آخر ان لوگوں کا ایسا کیا قصور ہے کہ اتنی بزرگی والی عمر میں ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ جواب ملا یہ تمام لوگ مجرم ہیں اگرچہ اِن کے جرائم زیادہ بڑے نہیں مگر یہ لوگ جرمانے ادا نہ کرنے کی پاداش میں یہاں قید ہیں اور مشقت کر رہے ہیں جواب دینے والا میرا دوست الیاس ہی تھا پھر مجھے الیاس نے کہا کہ آؤ میں تمہیں جیل کے مزید حصے دکھاؤں۔

پہلے وہ مجھے اپنے آفس میں لے کر گیا جہاں پر اُس نے میری فریش جوس سے تواضع کی اور کچھ دیر ہم خوش گپیوں میں مصروف رہے پھر وہ مجھے اُس حصے میں لے گیا جہاں کا اُس نے

کہا تھا۔

یہ ایک ایسا حصہ تھا جہاں اے سی لگے ہوئے تھے اور کچھ لوگ وہاں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، کیبل، ٹی وی لگے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون کی سہولت دستیاب تھی، خوبصورت آرام دہ بیڈ موجود تھے۔ طرح طرح کے کھانے کی ڈشیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کوئی جیل کے افسران ہیں اور یہاں کچھ دیر آرام کرنے یا کھانا کھانے آتے ہوں گے۔ پھر مجھے الیاس نے بتایا کہ یہ بھی قیدی ہیں، مجرم ہیں اور ان کے جرائم بھی بہت بڑے بڑے ہیں وہ جو پہلے ہم نے غریب اور بزرگ قیدی دیکھے ہیں وہ تو بے چارے چھوٹے موٹے معاملات میں پھنس کر یہاں آ گئے اور کئی ایسے تھے جو بھاری بھر کم جرمانے نہ بھرنے کی وجہ سے یہاں تھے لیکن یہ حضرات جو عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بڑے بڑے مجرم ہیں۔

یہ تمام باتیں سُن کر مجھ پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔

یہ کیا۔۔۔؟

کیا معاملہ ہے؟

یہ ہے بڑے بڑے مجرم؟

یوں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟

سچ پوچھے تو یہ اپنے گھروں سے بھی زیادہ آرام میں ہیں۔ پھر مجھے الیاس نے سمجھایا کہ یہ پاکستان ہے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے بااثر افراد جرم کر کے بھی مزے میں ہی رہتے ہیں اور غریب پر ہمیشہ قیامت گرائی جاتی ہے غریب لوگوں سے دانستہ یا نادانستہ کوئی چھوٹا موٹا جرم ہو جائے تو اُس کی پکڑ ہوتی ہے اور کڑی سے کڑی سزائیں دی جاتی ہیں مگر یہاں جب کوئی بااثر لوگ جرم کرتے ہیں تو اُن کی سزا ایسی ہی ہوتی ہے جیسی تم دیکھ رہے ہو۔ یہ باتیں سن کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ہے وہ پاکستان جو قائداعظم نے اور ہمارے اسلاف نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا

تھا۔؟

کیااس میں یہی کچھ ہونا تھا۔؟

کیا یہی آزادی ہے کہ بااثر افراد کی ہی بلے بلے ہواور غریب، کمزوراور نادار طبقہ ہمیشہ ہی ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرے۔؟

اسی صورتِ حال پہ میرے دوشعر۔۔۔

کوئی امیر ہے تو پھراُس کا بڑا خیال
کوئی غریب ہے تو پھراُس کے لیے وبال
اثرورسوخ ہے تو پھر آرام ہے یہاں
مفلس کے واسطے بُرا انجام ہے یہاں

☆☆☆

دسمبر کی سخت سردی نہ کوئی چادر، نہ رہنے کا کوئی ٹھکانہ، وہ حیران پریشان تھا اور عجیب عجیب سے خیالات اُسکے ذہن میں آرہے تھے۔سڑک پار کرتا ہوا اُس نے اپنے موبائل پر دیکھا، رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔تھوڑی ہی دور بازار سے آگے کچھ فاصلہ طے کیا۔نظر اُٹھا کے اُس نے دیکھا تو وہ چونک گیا۔

دوآدمی بڑی تیزی سے موٹر سائیکل پہ سوار آرہے تھے-قدبت سے پچیس چھبس کے معلوم ہوتے تھے۔اندھیرے میں موٹر بائیک کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اُن میں سے ایک کی بڑی بڑی مونچھیں، مونڈی ہوئی ڈاڑھی، اور گھنگریالے بال اور چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں تھیں-جبکہ دوسرے نوجوان نے اپنی سیاہ رنگ کی چادر سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا-

اُس نے بائیک کی سپیڈ دھیمی کر دی اور اُس سے ذرا گز دوگز فاصلے پر اپنی موٹر سائیکل روک دی۔وہ جس نے چادر سے منہ چھپایا ہوا تھا، جلدی سے بائیک سے نیچے اُترا اور پستول نکال کر اُسے دھکیلنے لگا اور گولی چلانے کی دھمکیاں دیتا ہوا، وہ اُس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔جو کچھ بھی ہاتھ آیا، اپنی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے اُس نے اُسے زور سے دھکا دیا اور وہ روڈ پر گر گیا۔وہ جلدی سے اپنی بائیک پر دوبارہ سوار ہوئے اور یہ جاوہ جا۔

"کوئی ہے؟۔۔۔۔۔۔۔کوئی ہے؟۔۔۔۔۔کوئی جا کے انہیں روکو،؟" وہ لگاتار چیختا رہا۔لیکن افسوس کوئی اُس کی مدد کو نہیں آیا اور وہ بڑے آرام سے نکل گئے۔

پہلے ہی اُسکی مصیبت کیا کم تھی کہ اوپر سے یہ سانحہ ہوگیا۔وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔اُس کے پاس جو تھوڑے بہت کھانے پینے کے لیے پیسے تھے، اب وہ بھی نہیں رہے اور رہائش کا کوئی بندوبست بھی تو نہیں تھا جبھی تو وہ سڑکوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ساری مصیبتیں ایک ساتھ، اُس کے سر پہ آن پڑی تھیں۔

یہ سوچ سوچ کر اُس کا دل ڈوب رہا تھا کہ انجان شہر، انجان لوگ نہ پیسے، نہ کھانا، نہ کوئی ٹھکانہ، اے خدا! اب تو ہی میرے حال پہ رحم فرما۔اب میں کیا کرونگا؟ کہاں جاؤنگا؟ یہ سوچتے سوچتے وہ آگے چلتا گیا۔تھوڑی دیر ہی میں اُسکے جسم نے اور آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ جسم تھک کر چور ہو گیا تھا بھوک الگ تنگ کر رہی تھی۔وہ فُٹ پاتھ کے ایک کنارے پہ جا کے لیٹ گیا تھوڑی ہی دیر میں اُسکی آنکھ لگ گئی۔

"او۔۔۔۔۔اواجنبی اُٹھو!" یہ سُن کر اُسکی آنکھ کھل گئی اور وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا۔۔۔۔؟" اُٹھ کر بیٹھتے ہی اُس نے اس بچے سے کہا، جس نے اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔

"ہاں کیا کر رہے ہو آپ؟ مجھے آپ یہاں کے رہائشی نہیں لگتے؟" بچے نے اُسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔کچھ دیر وہ خاموش رہا اور پھر اُسے سب بتا دیا۔

"جی میں ایک اجنبی ہوں، بڑی دور سے آیا ہوں لیکن مجھے کچھ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور میرے سارے پیسے لے گئے میرے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں ہے اس لیے یہاں پر سو گیا تھا"

"اُففف!۔۔۔۔۔اللہ پوچھے اِن لوگوں سے"۔بچہ اظہارِ افسوس کرتے ہوئے بولا۔

وہ سر جھکا کے تھوڑی دیر چُپ رہا۔پھر بچہ اُسے دیکھ کر بولا:

"آپ میرے ساتھ گھر آئیں۔میرا گھر پاس ہی میں ہے۔جہاں میں اور میری بوڑھی دادی رہتی

ہیں، جو کہ نابینا ہیں۔ہمارا بس یہی خاندان ہے اور کوئی نہیں ہمارا"۔

"نہیں۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" اُس نے منع کر دیا۔بچہ بار بار اصرار کرتا رہا-آخر اُسے منا کے اپنے گھر لے ہی آیا۔اُسے کھانے کا کہا لیکن اجنبی نے انکار کر دیا کہ نہیں وہ کھانا کھا چکا ہے، اور یہ کہ اُسے تھوڑی دیر سونا ہے۔یہ سُن کر بچہ دوسرے کمرے میں گیا اور اُسکے پاس چادر لے کے آیا۔اجنبی بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔اس لیے جلدی ہی اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔جب صبح ہوئی، سورج نکل آیا اور اسکی آنکھوں پہ روشنی پڑی تو وہ فوراً اُٹھ گیا۔بچہ اُسے دیکھ کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی لے آیا اجنبی نے منہ ہاتھ ابھی دھوئے ہی تھے کہ بچہ جلدی جلدی سے چائے اور پراٹھے اُس کے لیے اُٹھا لایا اور اُس نے بڑے پیار سے کھانا کھانے کی تلقین کی اور وہ مجبوراً سارا کھانا کھا گیا۔بھوک بھی تو زیادہ لگی ہوئی تھی اُسے۔

اجنبی شخص بچے سے رخصت لیکر جانے والا ہی تھا کہ ایک کونے میں پڑی تصویر پر اُسکی نظر پڑی۔پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ اس کے دادا جی ہیں۔جو اسکی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔اُس نے تصویر والے آدمی کو پہچان لیا تھا۔یہ وہی آدمی تھا، جو اس کے بچپن میں اس کے گاؤں میں کھلونے بیچنے آیا کرتا تھا۔پھر ایک روز سخت گرمی اور دھوپ کی وجہ سے اُسکی طبیعت بگڑ گئی تھی۔تو وہ اُسے اپنے ہجرے میں لے گیا تھا اور اُسے پنکھا جھلتا رہا، اُسے ٹھنڈا شربت پلایا اور اُسے آرام کرنے کا کہا۔یہ سب سوچتے ہوئے اُس نے اُوپر آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر چل دیا۔

"سچ ہے کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی"

☆☆☆

آستین کے سانپ

زمین پھٹی نہ عرش ہلا اُس نوجوان کی اچانک موت پر جس کی ایک دن قبل ہی تو شادی ہوئی تھی۔عمر نام کا نوجوان کتنا خوش تھا۔اُس کے دوست شادی کے موقع پر موجود تھے خوب بھنگڑا ڈالا گیا۔رات گئے تک ناچ گانا ہوتا رہا،صبح بارات ہوئی اور پھر بارات میں دوستوں اور رشتہ داروں کی خوب شمولیت اور خوشی۔لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ اگلے ہی دن اُس نوجوان کی موت ہو جائے گی۔

وہ نوجوان جو ہمیشہ دوسروں کی خوشیوں میں بھرپور طریقے سے شرکت کرتا،مگر آج اُس کا جنازہ پڑھایا جارہا تھا۔

کیسے ہوا یہ۔۔۔؟

کیا ہوا اس نوجوان کو۔۔۔؟ ہر دل میں سوالات کے بگولے اُٹھ رہے تھے،ہر آنکھ اشکبار تھی۔

کیسے مر سکتا ہے ایسا نوجوان؟

اُس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا دنیا میں،نہ جانے کیا کیا عزائم تھے اُس کے دل میں۔؟

ابھی اُس نے بہت کچھ کرنا تھا زندہ رہ کر،مگر تقدیر نے مہلت ہی نہ دی اور اس کا جنازہ تیار ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شادی کی اگلی رات دوستوں کے ساتھ رہا۔پھر جب وہ گھر پہنچا

تو لڑکھڑا رہا تھا اور گھر آتے ہی گر پڑا۔منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہوا۔

گھر والے اُسے لے کر ہسپتال جانے لگے لیکن وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔اللہ جانے اُس نے کیا کھالیا تھا یا کسی نے اُسے کچھ کھلا دیا یہ بات الگ تشنگی رکھتی ہے مگر تقدیر پر الزام کہ اُس نوجوان کو لے لیا،عین خوشی کے موقع پر،بعد میں ڈاکٹرز سے پتہ چلا کہ اُسکی موت زہر کھانے سے ہوئی ہے۔

کیا اس کے دوست۔۔۔؟

یا رشتہ دار۔۔۔؟

کون تھا جو کہ آستین کا سانپ ثابت ہوا۔۔۔؟

☆☆☆

کچھ واقعے، کچھ سانحے، کچھ حادثات زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے یہ زندگی کس لیے ملی، وہ پیدا ہی کیوں ہوا اور اگر پیدا ہو بھی گیا تو پھر مر کیوں نہیں گیا۔ ایسے واقعات، ایسے حادثات دیکھنے سے قبل اسے موت کیوں نہ آگئی۔

اس ست رنگی دنیا میں ایک رنگ سیاہ بھی ہے اور یہ رنگ ہمارے ہاں غم کی علامت سمجھا جاتا ہے، ست رنگی اس دنیا میں سیاہ رنگ تمام رنگوں پر غالب ہے یہ دنیا تلخ مزاج لوگوں سے بھری پڑی ہے ظلم، جبر، ستم، زمانے کی بے حسی محبوب کی بے وفائی، گھر والوں کا امتیازی سلوک، غربت، افلاس اور اس کی وجہ سے دوستوں میں تضحیک، مایوسیاں ہی مایوسیاں، دنیا میں دل توڑنے والے زیادہ ہیں، دل جوڑنے والوں کی نسبت، یہ تمام چیزیں مل کر انسان کی زندگی جہنم بنا دیتی ہیں۔

میں رہتا ہوں ایسی جہنم کے اندر
گزرتی سحر شام ہے غم کے اندر

انسان جب زیادہ دکھ برداشت نہیں کر پاتا تو اسے بعض اوقات زندگی کو نہ چاہتے ہوئے بھی خیر باد کہنا پڑتا ہے پھر بعد میں وہی لوگ جنہوں نے اس کا دل دکھایا جنہوں نے اس کی

تضحیک کی جنہوں نے بے وفائی کی وہی استفسار کر رہے ہوتے ہیں کہ اسے کیا ہوا تھا یہ کیوں چلا گیا اچھا بھلا تو تھا خوش وخرم لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس کی اندرونی زندگی اندرونی حالت کیسے تھے مگر جہاں یہ دنیا ظالم، بے وفا لوگوں سے بھری پڑی ہے وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ دنیا آج بھی قائم و دائم ہے ایسے لوگ کہ جن کے دل سے دعا کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا وہ دوسروں کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

میری زندگی میں ایک ایسا دوست بھی شامل ہوا کہ جس نے میری دکھوں بھری تلخ زندگی کو باغ و بہار، گل وگلنار اور رشک آمیز بنا دیا۔ وہ ایک فرشتہ تھا یا انسان، خوش مزاج، خوش شکل، نرم دل، باحیا، صابر، شاکر، وفادار، محبت سے لبریز دل، نفرت سے کوسوں دور، اعلیٰ ظرف، غرض وہ تمام خوبیاں جو ایک فرشتے میں ہونی چاہییں اُس میں موجود تھیں۔ مگر وہ ایک انسان تھا، میری زندگی کے خوبصورت، سنہری شاداب اور خوشیوں سے بھرپور دن۔۔۔ مگر میرے پاس ایسی کوئی گرائمر نہیں اتنا علم نہیں کہ میں اُس فرشتہ صفت کے بارے میں زیادہ لکھ سکوں مگر آج اُس کی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ہمت پا کر یہ چند ٹوٹے پھوٹے حروف لکھنے پر مجبور ہوا حالانکہ یہ میری اوقات سے باہر ہے۔

جب وہ صنفِ نازک میری زندگی میں آئی میری زندگی بے ڈھنگ تھی، بے مزہ تھی، اداس تھی، زمانے کی تلخیاں تلوار بن کر گھاؤ لگاتی تھیں، پھر بھی میں مجبوراً زندگی گزار رہا تھا مگر پھر جب میری اُس فرشتہ صفت، مہ وشِ پیکرِ حسن و جمال، باوفا، باوصف اور سب سے بڑھ کر ہم خیال، خوش رنگ، خوش لباس، ہنس مُکھ سے ملاقات ہوئی تو میری زندگی کے رنگ چمکنے لگے، دن تو دن رات بھی سہانی لگنے لگی، غمگین زندگی میں خوشیاں بھر گئی، غم بھول گئے، لوگوں کی بے اعتنائیاں رفع ہو گئیں، تلخیاں غائب ہو گئیں اور مجھے چار سو پھول ہی پھول نظر آنے لگے۔ شاید یہ بھی میرے ماں باپ، بہن بھائی اور دیگر مخلص دوستوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ مجھے ایک ایسا انسان مل گیا جو مجھے سمجھ

سکتا تھا میری ہر بات کو اپنی بات سمجھنے والا انسان، انسان ایسا گویا فرشتہ، جس نے کٹھن راہوں کو آسان کر دیا، سنسان راہوں کو سنوار دیا، میرا اعتماد بنا، مجھے اعتماد دیا، دوست جیسی محبت دی، دل کو سکون دیا۔

یقیناً یہ مجھ پر میرے خدا کا انعام ہوا کہ اُس نے مجھے ایک محسن سے آشنا کر دیا اب مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا ہے کہ مجھے زندگی کا حوصلہ دینے والا انسان جس سے میں کھل کر مشاورت کر سکتا ہوں اور ایک اچھے جواب کی توقع کر سکتا ہوں۔ الغرض میں نے پورے جیون میں ایسا پُر خلوص، با اعتماد، اعلیٰ مزاج بشر کم ہی دیکھے ہے اب میں اُسے کسی حال میں کھونا نہیں چاہتا وہ میرا مان، میری جان، مجھے عزیز، میری وجہِ سکون، اللہ پاک اُسے شاد و آباد رکھے ہر امتحان میں سرخرو فرمائے، مشکلیں، رنج اُس کے قریب نہ بھٹکیں اور وہ ہمیشہ سُکھی رہے، میرا مخلص دوست صنفِ نازک، فرشتہ صفت شاد رہے آباد رہے۔

دل میں میرے سدا شاد رہے گی
تُوں فرشتہ ہے آباد رہے گی
دل کے قریں وجہِ سکون ایک دوست کی نظر
آ، دیکھنے پھر وہ حور چلیں
چلو یاروں! بہاولپور چلیں

☆☆☆

حسبِ معمول آج بھی ثمینہ دیر تک سوتی رہی، آفس جہاں وہ جاب کرتی تھی، چھٹیاں تھیں جلدی اُٹھ کر وہ اپنے معمول کے گھریلو کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ خیر محمد دور چار پائی پر بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتی، میں جب بھی پوچھتا ہوں تو یہ ٹال مٹول کر جاتی ہے پھر وہ اُٹھ کر ثمینہ کے پاس گیا اور وہی سوال کرنے لگا مگر ثمینہ تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوتی کوئی جواب نہیں، ہاں وہ مسکرا کر دیکھتی تو خیر محمد بھی خوش ہو جاتا مگر خیر محمد بھی بار بار سوال پوچھ پوچھ کر تنگ آ گیا تھا وہ جواب چاہتا تھا۔ چلو کبھی تو بتائے گی۔

اگلے دن پھر خیر محمد نے وہی سوال کر ڈالا مگر ثمینہ جواب دینے میں ناکام رہی۔ خیر محمد کی سوالیاں نگاہیں دیکھ کر وہ سر جُھکا لیتی اور مایوس دکھائی دیتی۔ آج جب خیر محمد صبح چار پائی پر بیٹھا ثمینہ کو کام کرتے دیکھ رہا تھا اور اپنا سوال دل ہی دل میں دہرا رہا تھا کہ اچانک ثمینہ کی فون کی گھنٹی بجی، ثمینہ دوڑی اور فون اُٹھا لیا، دوسری طرف نہ جانے کون تھا مگر کال سنتے ہی ثمینہ کے چہرے پر خوشی کے تاثرات اُبھرے۔ تھوڑی سی بات ہوئی اور پھر خوشی کے تاثرات مایوسی میں بدل گئے اللہ جانے دوسری طرف والے نے کیا بات کی کہ ثمینہ انتہائی پریشان دکھائی دینے لگی۔ اُس کا لہجہ کرخت لگنے لگا پھر کال ختم ہوئی اور ثمینہ پھر کام میں مصروف ہوگئی خیر محمد اُٹھا اور ثمینہ کے قریب گیا وہ اُسے قریب آتا دیکھ کر پریشان ہوگئی اپنا دوپٹہ سیدھا کیا اور سر جُھکا لیا خیر محمد نے پھر وہی سوال

کیا وہ کہنے لگا" بیٹا! آخر تم کیوں نہیں بتا دیتی مجھے اپنا دکھ؟ تم کیوں پریشان رہتی ہو؟ اور یہ فون پر کون تھا جو تمہیں اتنا پریشان کر گیا؟ تم بتاتی کیوں نہیں کہ تم چھٹیوں میں اپنے گھر کیوں نہیں جاتی ؟ بیٹا! تم میری بیٹی کی طرح ہو آخر کیا وجہ ہے" خیر محمد کافی پریشان تھا۔

ہمیشہ کی طرح ان چھٹیوں میں بھی ثمینہ گھر نہ گئی بلکہ ہاسٹل میں رہنے کو ہی ترجیح دی۔

مگر ہاسٹل والے کہاں رہنے دیتے ہیں اکیلی لڑکی کو، لہٰذا چاچا خیر محمد اُسے اپنے گھر لے گیا جو کہ ہاسٹل سے تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ خیر محمد کہنے لگا میری بیٹی تم مجھے اپنا دکھ بتاؤ تو سہی، دکھ باٹنے سے کم ہوتا کون تھا فون پر مجھے بتاؤ؟ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ چاچا خیر محمد نے ثمینہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اتنا پیار اور خلوص پا کر ثمینہ کے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور پھر رہا نہ گیا۔۔۔ کہنے لگی ۔۔۔ یہ میرا بھائی تھا۔

بھائی؟ خیر محمد نے حیرت سے کہا" تمہارا بھائی بھی ہے" تو پھر تم گھر کیوں نہیں جاتی۔

وہ کہنے لگی، جی بھائی! سوتیلا بھائی، میرے سگے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ بول رہی تھی اور رو بھی رہی تھی بس یہی بھائی ہے جو سوتیلا ہے ہر ماہ باقاعدگی سے فون کرتا ہے مگر خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ میری تنخواہ لینے کے لیے صرف تنخواہ کا مطالبہ۔ اُس نے کبھی میری خیریت تک نہیں پوچھی گھر بلانا تو دور اور اگر میں گھر چلی بھی جاؤں تو میری تمام تنخواہ لے کر چلا جاتا ہے اور پھر مجھے فاقے کرنے پڑتے ہیں اس لیے میں گھر نہیں جاتی گھر میں ہے ہی کون میرا جس کے لیے جاؤں اور پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔

☆☆☆

14 اگست یومِ آزادی جوں جوں قریب آ رہا ہے لوگوں میں جذبہ حُب الوطنی میں شدت آتی جا رہی ہے جذبہ پاکستانیت جاگ رہا ہے۔ کیا ریڑھی والے کیا دوکاندار، کیا پیدل، کیا سوار ہر شخص ہی پاکستان پر جان قربان کرنے کے دعوؤں میں لگا ہے کوئی جھنڈیاں لگا رہا ہے تو کوئی بینڈ باجے خرید و فروخت کر رہا ہے یہ تمام ٹھیک ہے جذبہ حُب الوطنی ہونا چاہیے وطن پر جان نثار کرنے کا ولولہ ہونا چاہئے مگر یہ جذبہ سارا سال کہاں رہتا ہے؟؟؟

میں سوچتا ہوں بہت دکھ ہوتا ہے ہم کیسے پاکستانی ہیں؟ کیسے مسلمان ہیں؟ سال بھر دھوکہ دہی، گراں فروشی، بے ایمانی، رشوت، سفارش میں لگے رہتے ہیں گو یا ایک دوسرے کو نوچ کھانے کے در پے ہیں ہمیں کبھی یاد نہ آیا کہ ہم پاکستانی ہیں۔

قائداعظم نے پاکستان کس لیے بنایا، کیا ضرورت پیش آئی، کیا دھوکہ دہی پہلے نہ تھی؟

کیا بے ایمانی پہلے نہ تھی؟

کیا لوگ پہلے ایک دوسرے کو نوچ کر نہ کھا رہے تھے؟

یہ سب کچھ پہلے بھی تھا۔ پاکستان بنانے کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کہ مسلمان جو کہ ایماندار بھی ہے پارسا بھی ہے نیک بھی ہے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے والا بھی ہے وہ بغض،

نفرت سے دور رہنا چاہتا تھا یہ تمام برائیاں جو ہندوؤں میں تھیں اُن سے الگ ہونا چاہتا ہے اس جذبے کے تحت پاکستان بنا اور آج کہاں گیا وہ جذبہ آج ہم ایک دوسرے کو نوچ کھانے میں لگے ہوئے ہیں ایک دوسرے کا حق مارنے میں سب سے آگے ہیں۔ ہم قائداعظم کے فرمودات کو فراموش کر چکے ہیں، ایمان، اتحاد، تنظیم یہ فرمودات کسے یاد ہیں ہم پہلے فرمان کی ہی مخالفت میں لگے ہیں کہاں ہے ایمان؟ بے ایمانی عام ہو چکی ہے ہمارے معاشرے میں ناپ تول میں کمی کا رواج بڑھ چکا ہے، بازاروں میں من مانے ریٹ ناقص چیز کو اچھا کہہ کر بیچ رہے ہیں۔

مجھے دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر قائداعظم کا فرمان تنظیم، اتحاد ایمان آج پارہ پارہ ہو چکا ہے ہر کوئی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں لگا ہے۔ فرقہ پرستی عام ہو چکی ہے۔ سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھا دکھا کر اپنا الو سیدھا کرنے میں مصروف ہیں۔

کہاں ہے اتحاد؟

کہاں ہے پاکستانیت؟

کیا یہی ہماری آزادی ہے؟

کیا صرف چودہ اگست کے دن ہی یہ جذبات دکھانے کے لیے رہ گئے ہیں؟

کیا صرف ایک دن سبز ہلالی پرچم لہرا دینے سے ہم سچے پاکستان بن گئے ہیں؟

کاہے کا جشن کاہے کی آزادی ہے
ہر سو یاں مسلمان کی بربادی ہے

کون سی ایسی برائی نہیں ہے جو ہم میں نہیں۔ ہر بری خصلت پائی جاتی ہے ہم پاکستانیوں میں مگر جب چودہ اگست آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم سب سے پارسا قوم ہیں جیسے سبزیوں کا ایک سیزن ہوتا ہے جیسے پھلوں کا ایک سیزن ہوتا ہے، جیسے سردیوں کا سیزن ہوتا ہے، جیسے بہار کا سیزن ہوتا ہے، ویسے ہی ایک سیزن اپنے آپ کو محبُ الوطن ثابت کرنے کا ہے۔ اگست کے مہینے میں ہم

تجدیدِ عہد کرتے ہیں کہ قائداعظم کے فرمودات، کام کام کام اور ایمان اتحاد تنظیم پر ہمیشہ کاربند رہیں گے یہ محض ایک دعویٰ ہوتا ہے اس پر عمل کون کرتا ہے بالکل ایسے ہی رمضان المبارک میں ہر شخص ہی پارسا بنا پھرتا ہے پانچ وقت کا نمازی، ہمہ وقت عبادت میں مصروف بلاشبہ یہ ہونا بھی چاہیئے۔ مگر یہ صرف ایک مہینے کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک سیزن ہے نیکیاں کرنے کا اور پھر اس کے بعد وہی چوری، وہی ناپ تول میں کمی، وہی کساد بازاری، وہی بے ایمانی۔

میں سوچتا ہوں کیا یہ جذبہ حُب الوطنی یہ نیکیاں کرنے کا جذبہ پورا سال نہیں چل سکتا؟

کیا ہم پورا سال پاکستان پر جان قربان نہیں کر سکتے؟

کیا ہم ناپ تول میں کمی چھوڑ نہیں سکتے؟

کیا ہم بے ایمانی ترک نہیں کر سکتے؟

کیا ہم فرقہ پرستی سے نکل کر ایک قوم نہیں بن سکتے؟

اگر نہیں تو پھر کیسی آزادی؟

ہم آج بھی غلام ہیں اپنی بری عادتوں کے جنہیں ہم کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ آخر کب تلک ہمارا یہ سیزنی ایمان چلتا رہے گا۔ کیا محرم الحرام میں پانی کی سبیلیں لگانے کی نیکی سارا سال نہیں چل سکتی۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال پر سید مبارک شاہ صاحب اپنے اس شعر میں طنز فرماتے ہیں۔

دس روز تک روا ہے ماتم حسین
پھر سال بھر اطاعت شمر و یزید کر

☆☆☆

بوڑھا باپ سر جُھکائے بیٹھا اپنے بیٹے دلشاد کی یادوں میں گم تھا پانچ سال سے زائد ہو گئے اُس کا کچھ پتہ نہ چل سکا اللہ جانے کہاں چلا گیا زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا اُسے۔ یہاں سے تو وہ باقاعدہ ویزہ لگوا کر غیر ملک گیا تھا۔ پھر وہاں اُس کو کچھ عرصہ تو جاب نہ مل سکی مگر بعد میں اُس نے فون پر بتایا تھا کہ اُس کا ایک دوست مارشل جو کہ اُسے ائیر پورٹ پر ہی ملا تھا شروع شروع میں دلشاد اُس کے ٹھکانے پر گیا اور اُسے اپنی بے روزگاری کے بارے میں بتایا۔ مارشل نے اُس کی باتیں سُنیں اور اُسے اپنے کاروبار کے آفس میں لے گیا جہاں جارج نامی شخص سے ملاقات ہوئی اور اُسے ایڈوانس کے طور پر کافی ساری رقم بھی مل گئی اور باقاعدہ کام بھی مل گیا۔ اُس کے بعد دلشاد گھر پیسے بھیجنے لگا۔

تمام لوگ بہت خوش تھے کہ چلو دلشاد کو ملازمت مل گئی سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ سب کی اُمیدیں بر آئیں۔ اور خصوصاً دلشاد خود بھی کافی خوش تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ یہاں آیا تھا وہ آج پورا ہوا۔ یقیناً گھر کے مسائل اُسے چین کی نیند نہیں سونے دیتے تھے۔ غربت کی انتہا تھی۔ ایک وقت کی کھا بیٹھتے تھے تو دوسرے وقت کی فکر ستاتی تھی۔ والد لاکھوں کا مقروض ہو گیا تھا۔ بہن کی شادی بھی تو کرنی تھی۔ اُس کا جہیز بھی اکٹھا کرنا تھا۔ مگر وہ گھر میں رہ کر کچھ نہ کر سکا اور کہیں نہ

کہیں سے پیسے اُدھار اُٹھا کر بیرون ملک کا ویزہ لگوا لیا اور اپنے اچھے دنوں کے خواب لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ اگرچہ یہاں تین چار ماہ تک اُسے کوئی کام نہ مل سکا۔ بہت پریشانی میں دن گزرتے رہے۔ گھر تو وہ پیسے کیا بھیجتا۔ وہ خود کئی دنوں تک فاقوں میں رہا۔ لیکن پھر قدرت نے اُس کی سُن لی اور مارشل جیسے مخلص دوست سے ملاقات ہو گئی اور ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔

اب وہ ہر ماہ گھر ایک معقول رقم بھیجتا رہتا جس سے گھر والے بہت خوش تھے۔ بہن کا جہیز بھی تیار ہو رہا تھا نئے مکان کے لیے جگہ بھی خرید لی گئی۔ ہر دوسرے تیسرے دن فون آ جاتا اور دلشاد کا حال سب گھر والے سُن کر سُکھ کا سانس لیتے۔ اسی طرح دن مہینے گزرتے رہے۔ دلشاد پیسے بھیجتا رہا اور گھر والے خوش ہوتے رہے اور دعائیں دیتے رہے۔ روز فون پر بات بھی ہو جاتی اور ماں باپ خوش ہوتے۔ پھر دلشاد نے بتایا کہ جس کمپنی میں وہ ملازم ہے اُس کے مالک نے اس کے کام سے متاثر ہو کر ایک بڑی کار بھی گفٹ کی ہے اور اب وہ کار میں گھومتا رہتا ہے وہ گاڑی اس کی پرسنل ہے۔ اس نے اپنے گھر والوں کے خواب پورے کر دیئے۔

سب لوگ فخر محسوس کر رہے تھے۔ گھر والے اکثر فرمائشیں بھی کر دیتے۔ بہن کی فرمائش الگ ہوتی اور دیگر گھر والوں کی بھی بڑی بڑی فرمائشیں۔ دلشاد تمام فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ ایک سال گزر گیا۔ پھر دوسرا سال۔ مگر دلشاد کو چھٹی نہ مل سکی۔ بس فون پر ہی بات ہوتی رہتی۔ پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ دلشاد کے پیسے آنا بند ہو گئے۔ وہ کال بھی کبھی کبھی کرتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا کہ کمپنی کو لاس ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر ایک دن یہ کبھی کبھی کال والا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ گھر والے پریشان ہوئے لیکن پھر کئی ماہ گزر رے، پھر سال پورا گزر گیا اور دلشاد کا کوئی فون تک نہ آیا۔ گھر والے نمبر ملانے کی کوشش کرتے تو نان ریسپانڈنگ کا اعلان ہوتا۔ بہت تشویش ہوئی۔

دوسرا سال گزر گیا اور پھر تیسرا چوتھا اور اب پانچ سال ہونے کو آ گیا۔ مگر گھر والوں نے فون سے اُمیدیں نہ توڑیں۔ فون آج بھی گھر پر موجود تھا۔ روز گھنٹیاں تو بجتیں مگر وہ کسی اور کی

ہوتیں۔ بوڑھا باپ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر اچانک ایک گھنٹی بجی فون کی ۔۔۔۔ بوڑھا باپ پر اُمید ہو کر فون پر لپکا۔۔۔۔ رسیور اٹھا کر ہیلو کیا۔

دوسرے جانب سے آواز آئی۔۔۔ہیلو! آپ عبدالرحمن بول رہیے ہیں؟

جی جی، میں عبدالرحمن ہی ہوں، آپ کون؟ بوڑھے باپ نے پُر اُمید ہو کر کہا۔

دلشاد آپ کا بیٹا ہے؟ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

جی جی وہ میرا ہی بیٹا ہے، کہاں ہے وہ؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ میری بات کراؤ اُس سے۔تم کون ہو؟ تم کیسے جانتے ہو اُسے؟ کہاں ہیں وہ؟ ایک ہی سانس میں اُس نے یہ سب سوال پوچھ ڈالیں۔

پھر دوسری جانب سے آواز آئی: وہ ٹھیک تو ہے مگر۔۔۔۔۔۔۔

مگر کیا؟ بوڑھے باپ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔۔۔۔۔۔جلدی بتاؤ مجھے کیا ہوا اُسے؟

وہ یہاں جیل میں ہے کئی سالوں سے، جیل میں؟ اس پر لگایا گیا الزام ثابت ہو چکا ہے۔ دوسرے جانب سے جواب آیا۔ وہ ڈرگز ڈیلر ہے اُس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہے اگر آپ میں سے کوئی قریب موجود ہے تو وہ اپیل کیلئے درخواست دائر کر سکتا ہے وگرنہ اُسے جلد ہی پھانسی دے دی جائے گی۔

بوڑھے باپ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا رسیور اُس کے ہاتھ سے گر گیا اور کال بند ہو گئی۔

☆☆☆

آج وہ بہت اداس تھا اتنا اداس کہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک عیاں تھی، وہ اداس ہوتا بھی کیوں نہ وہ سارے جہان سے کٹ جو چکا تھا اپنے تو اپنے پرائے بھی اُس سے دور دور رہنے لگے تھے کوئی اُسے منہ لگانے کو تیار نہ تھا، سب کو بس اپنی اپنی ہی فکر تھی کوئی کسی کی فکر نہیں کرتا کوئی کسی کی نہیں سُنتا نفسا نفسی کے اس دور میں بغیر مطلب کے کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا کوئی حال تک نہیں پوچھتا۔

داستاں سُننا تو دور کی بات، بکھرے بال، اُڑی رنگت، زبوں حال، پریشان، وہ نوجوان، دیوانہ، پاگل، یا کچھ بھی کہہ لو، حالات کا مارا ہوا، اپنی دنیا میں گم اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا، سب چھوڑ گئے، اپنے بھی غیر بھی، کوئی میری بات نہیں سُنتا، کسی کو بھی میرے مسئلوں سے کوئی غرض نہیں ہے، مجھے زیست نے کیا دیا ہے، کچھ نہیں؟ ہاں دیا بھی ہے کچھ، کیا؟ پریشانیاں، دھوکے، غربت، افلاس، بے روزگاری، طعنے، گالیاں، دھکے، یہی سب کچھ اور کسی نے بھی نوٹس تک نہ لیا، آخر کیوں، لوگ میری بات کیوں نہیں سُنتے۔ سب مجھے چھوڑ چکے کوئی نزدیک نہیں لگتا میرے، میں جس کو بھی اپنی بپتا سناؤں وہ اُلٹا نفرت سے دیکھتا ہے مجھے، کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں؟ اُسے شاید یہ نہیں معلوم کہ لوگ اُکتا جاتے ہیں ایک

ہی بات بار بار سُننے پر، بھلا آج کس کے ساتھ یہ نہیں ہو رہا۔

زندگی میں غم تو سب کو ملے ہیں کسی کو زیادہ تو کسی کو کم، خوشیاں تو بہت کم حصے میں آتی ہیں، زندگی ہے ہی دکھوں کا نام، مسائل کا گورکھ دھندہ، یہاں وہی خوش رہ سکتا ہے جو دنیا سے لڑ سکتا ہو، مسائل سے نپٹ سکتا ہو، دکھوں کو جھیل سکتا ہو، وہ نوجوان، خوبصورت نوجوان تھا بالکل نارمل، پڑھا لکھا، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا اُس کے ساتھ، ایک مدت سے اُداس سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کی تمیز بس اپنے آپ سے باتیں کیے جاتا ہے تنہا تنہا، اکیلا اپنے آپ سے سوال و جواب، کسی نے سُنا، وہ کہہ رہا تھا سب چھوڑ گئے مجھ کو، فقط ایک ہی میرا سہارا ہے بس وہ میرے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گی بس یہی تنہائی میرے ساتھ رہے گی ہمیشہ اور یہ شعر اکثر زبان پر لاتا رہا۔

میرے اپنوں نے بے وفائی کی
اور غیروں نے کج ادائی کی
کیا، یہ، دنیا کو زیب دیتا ہے
ایک مفلس سے جگ ہنسائی کی

☆☆☆

وارننگ

رات کے دس بج رہے تھے اور میں ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا یہ میرا معمول ہے میں رات کو سونے سے قبل لازمی کچھ مطالعہ کرتا ہوں یا پھر کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں جس سے میرے ذوق کی تسکین ہوتی ہے گھر کے تمام لوگ سو چکے تھے اور کافی سناٹا تھا پھر اچانک گھر کی کھڑکیاں ہلنے لگیں میں گھبرا گیا، سر میں چکر آنے لگے، چھت کا پنکھا بری طرح ڈولنے لگا، میز پر رکھا چائے کا خالی کپ نیچے گر گیا اور بہت سی چیزوں کے گرنے کی آواز کانوں میں پڑنے لگی۔

گھر والے جاگ گئے اور تمام استغفار پڑھنے لگے۔ زلزلہ تھا یہ کافی زور کا زلزلہ، میں جلدی سے باہر نکلا گھر والے بھی صحن میں آ چکے تھے اور استغفار پڑھے جا رہے تھے گیٹ کے باہر گلی میں پڑوس والے اور دیگر لوگ باہر نکل کر استغفار پڑھ رہے تھے، زلزلہ زور کا تھا، کھمبوں کی تاریں بھی مرتعش تھیں، جھٹکے چند منٹس تک جاری رہے کچھ دیر میں ایمبولینس کے سائرن سنائی دینے لگے شاید کسی علاقے میں کچھ نقصان بھی ہوا۔

تھا تھوڑی دیر میں زلزلہ رُک گیا لوگ اپنے اپنے گھروں میں واپس چلے گئے، میرے گھر والے بھی تھوڑی دیر زلزلے پر بات چیت کرنے کے بعد اپنے اپنے کمروں چلے گئے میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر خاموشی چھا گئی جیسے سب کچھ معمول پر آ گیا ہو، مجھے موبائل پر میسجز آ

رہے تھے کچھ دوستوں سے فون پر بھی معلوم ہوا کہ زلزلہ بہت زور کا تھا اور ملک بھر میں جھٹکے محسوس کیے گئے۔

میں سوچنے لگا زلزلہ کیا ہے؟ شاید ہمارے اعمال کی سزا یا وارننگ؟ رب کی ناراضگی جسے ہم سمجھ ہی نہیں پائے، گناہوں پر گناہ کیے جاتے ہیں، نام کے مسلمان بن کے رہ گئے، بے ایمانی، ناپ تول میں کمی، دوسروں کا حق غصب کرنا ہمارے معمولات میں شامل ہے، کون سی ایسی برائی ہے جو ہم میں نہیں، بے حیائی عام ہے، عبادات محض نمود ونمائش بن کر رہ گئیں، خود کو عاشق رسول کہنے والے ہم لوگ کیا کچھ نہیں کرتے، لوگوں کی املاک جلا دینا، گاڑیاں جلانا، راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، دکھی انسانیت کے دکھ میں اضافہ کرنا ہمارا شیوہ ہے، جواء، سُود ہمارے معاشرے کا ناسُور ہیں، دھوکہ فراڈ، بے ایمانی، کام چوری، حرام خوری ہمارے معاشرے میں رچ بس چکی ہیں۔

ایسے میں زلزلے نہ آئیں تو کیا ہو؟

مصیبتیں نہ آئیں تو کیا آئے؟

اور پھر ایسی خطرناک بیماریاں، وائرس، کا پھیلاؤ کس بات کی علامات ہیں۔

کیا ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں؟

پھر ہم سوچتے ہیں کہ ہم تو مسلمان ہیں ہمارے اُوپر غیبی امداد کیوں نہ آئی۔؟

کیسے مسلمان ہیں ہم؟

اپنے نبی ﷺ کی کتنی سنتوں پر عمل پیرا ہیں؟

کتنے حقوق العباد ادا کر رہے ہیں؟

کتنے حقوق اللہ کی بجا آوری میں لگے ہیں؟

یہ زلزلے، سیلاب، طوفان، خطرناک بیماریاں، وائرس عذابِ الٰہی نہیں تو کیا ہے؟

مگر کس کو پشیمانی ہوئی؟

کون پیچھے ہٹا گناہوں سے؟

کس نے بے ایمانی چھوڑی؟

ناپ تول میں کمی اب بھی جاری ہے، سود دھڑلے سے کھایا جا رہا ہے سب کے سب گناہ ویسے ہی چل رہے ہیں کسی نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ یہ زلزلے تو خبرداری ہے، اللہ کی جانب سے کہ اے انسان! سدھر جا ورنہ اس کا عذابِ علیم تیار ہے۔

اب بھی سدھر جا، وہ رب بار بار وارننگ دیتا ہے وہ رب رحیم جو ستر ماؤں سے زیادہ ہم سے پیار کرتا ہے، وہ ناراض ہے ہم سے مگر ہم ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، گناہوں پر گناہ کیے جاتے ہیں، سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، زلزلے وغیرہ دو چار دن ہی ہماری زندگی بدلتے ہیں اور پھر وہی ڈگر، وہی بے ایمانی، وہی سود، حرام خوری، اور وہی سب کچھ۔ اللہ پاک ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

تاریکی، سناٹا اور رات کا پچھلا پہر دل پر خوف ایسا کہ ذرا سی آہٹ پر دل زور سے دھڑک اُٹھتا، اگرچہ تمام گھر والے نیند کی گہری آغوش میں جا چکے تھے مگر پھر بھی کھٹکا اس بات کا کہ کون کب اُٹھ بیٹھے۔

وہ اپنا سامان سرِ شام ہی باندھ کر گھر میں کسی خاص جگہ پر چھپا چکی تھی۔ پروگرام پہلے ہی طے تھا سو وہ دبے قدموں اُٹھی، ماں کی چارپائی کے قریب سے ہوتے ہوئے ایک لمحے کو ماں کے چہرے پر دیکھا۔

ماں وہ ماں جس نے اپنی زندگی وار دی اُسے جوان کرنے میں، اُس کی ہر بات کا خیال رکھنے میں۔ وہ ماں جس کو مان تھا کہ اس کی بیٹی جیسا باحیاء، باکردار کوئی نہیں۔ بات بات پر واری واری جاتی۔ بات بات پر بیٹی کا ماتھا چوم لیتی۔ پھر اچانک اس نے سر کو جھٹکا اور خیال سے باہر نکل کر گھر سے بھاگ نکلی اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔

اسٹیشن گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا، چھوٹے شہر کا چھوٹا سا اسٹیشن زیادہ تر ویران ہی رہتا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ پہلے ہی آچکا ہوگا اور میرے دیر سے آنے پر سخت خفا ہوگا پھر میں اُسے بتاؤں گی کہ گھر میں آج سارے سوئے ہی بہت دیر سے تھے بڑی مشکل سے بھاگی ہوں

گھر سے۔ خوش قسمتی سے رات کے اس پہر اُسے سوائے چند آوارہ کتوں کے اور کسی سے واسطہ نہ پڑا اور وہ جلد طے شدہ مقام پر پہنچ گئی۔ اسٹیشن کے ایک تاریک کونے میں۔

مگر یہ کیا؟ وہ ابھی نہیں پہنچا؟ شاید اُدھر ہو، اُس نے چاروں طرف نظر گھمائی، اسٹیشن پر کچھ لوگ موجود تھے مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا پھر خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔ آجائے گا لیٹ ہے وہ بھی میری طرح، آجائے گا ابھی۔ آدھا گھنٹا گزر گیا پر وہ نہیں آیا۔ وہ اب بھی پُرامید تھی اور انتظار کرتی رہی۔ اُسے ایک ایک لمحہ صدیوں کا لگنے لگا۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا پھر اور ایک گھنٹہ گزر گیا پھر اور ایک گھنٹہ۔۔۔۔ مگر وہ ابھی تک اکیلی تھی، اب آہستہ آہستہ اُس کی اُمید دم توڑنے لگی، اب پچھتاوا ہونے لگا، ماں کی محبت، باپ کا غیرت مند چہرہ، آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔

اُس نے غیرت مند باپ کو بے غیرت بنا دیا، اب وہ منہ چھپاتا پھرے گا زمانے سے، اس کی وجہ سے، یہ کیا کر بیٹھی، کاش ایک لمحے کو سوچ لیتی۔ پھر فجر کی آذان کانوں میں پڑی وہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ اب کیا کروں؟ اُس نے کہا تھا کہ میں لازمی آؤں گا۔ میں تجھ بن جی نہیں سکتا۔ مگر یہ کیا؟ وہ نہیں آیا؟ اب تک تو گھر والوں کو خبر ہوگئی ہوگی، کس کی باتوں میں آگئی میں، اب کیا ہوگا، کس منہ سے گھر واپس جاؤں، وہ باکردار سے بدکردار بن چکی تھی، گھر سے بھاگی ہوئی بدکردار لڑکی۔

☆☆☆

میاں بیوی

”بس کراب اُٹھ بھی جا۔ بازار سے پکانے کے لیے کچھ لے آؤ۔“

”پھر بازار تم ایک بار میں سب کیوں نہیں منگواتی ؟“

”میں بھول گئی تھی۔“

”تمہیں یاد ہی کیا رہتا ہے سوائے کھانے کے۔“

”میں کھانا! میں کہاں کھانے کی شوقین ہوں، کھانا تو تم ہر وقت ٹھوستے رہتے ہے۔“

”ہاں ہاں بالکل تم تو سارا دن میرا دماغ کھاتی ہوناں کھانا تو صرف میں ہی کھاتا ہوں۔“

”بس باتیں نہ بنائیں جائیں کچھ لے آئیں۔“

”تم مجھے کبھی سکون سے بیٹھنے نہیں دینا۔“

”ہاں ہاں سکون تو میں نے ہی برباد کیا ہے ناں جیسے“

”بس کر میرا دماغ مت کھاؤ۔“

”تمہارے پاس دماغ ہے کہاں کہ میں کھا جاؤں۔“

”ہاں ہاں میرے تو سر میں بھوسا بھرا ہوا ہے ناں دماغ تو تمھارے پاس ہے جو ہر وقت دوسروں میں بانٹتی پھرتی ہو۔“

”بس تمہیں تو لڑنے کا بہانہ چاہیے“

”لڑنا!۔۔۔۔۔۔میں کہاں لڑتا ہوں“

”ہاں، ہاں۔۔۔۔۔۔۔لڑتی تو جیسے میں ہوں ناں۔“

”چپ ہو جا میرے دماغ کی لسی مت کر۔“

”ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔دماغ کی لسی نہیں دہی ہوتی ہے مثال بھی ٹھیک سے نہیں دے سکتے۔“

”لوگوں کا دماغ دہی ہوگا۔ میرا دماغ ہے میری مرضی تمہیں اس سے کیا لسی ہو یا دہی۔“

”ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔بلکل بے وقوف ہو۔“

”ہاں ہاں بیوقوف ہی تو ہوں۔“

”شکر مان تو لیا کہ بیوقوف ہو۔“

”جی جی بیوقوف ہی تو ہوں محترمہ تبھی تو تم سے شادی کی ہے۔ اگر ہوشیار ہوتا تو شادی ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی تو تم سے تو بلکل نہیں کرتا لیکن میں ہی آندھا بیوقوف تھا میری ہی قسمت پھوٹی تھی کہ تم کو پسند کر لیا۔“

”تم نہیں میرے ماں باپ آندھے تھے کہ تم جیسے نکمے کے حوالے کیا مجھے، وگرنہ میرے لیے رشتوں کی کمی تھوڑی تھی۔“

”ہاہاہا۔۔۔ جیسے تمہارے کے لیے راجہ مہاراجہ کے رشتے آئے اور تم نے ٹھکرا دیئے۔“

”شکر کریں تمہیں میں نے قبول کیا وگرنہ تمہیں کون لڑکی دیتا تھا؟“

”تم سے بھی تو تیرے ماں باپ تنگ تھے تبھی تو اُس نے میرے سر پہ یہ مصیبت تھوپ دی“

”کیا کہا میں مصیبت۔“

”ہاں تم مصیبت۔۔۔۔۔۔۔مصیبت ہی تو ہو۔“

”تم بھی تو کوئی مصیبت سے کم نہیں ہو۔ لیکن یہ تو میرا حوصلہ ہے کہ تم کو برداشت کر رہی ہوں۔“

"بس بس بات کو مت بڑھاؤ۔"

"ہاں ہاں بات تو میں بڑھا رہی ہوں ناں تم تو جیسے خاموش بیٹھے ہو۔"

"چُپ ہو جا۔۔۔۔۔۔آرام کرنا ہے مجھے سونے دو۔"

"سونا بعد میں۔۔۔۔۔۔۔۔بازار سے کھانا کے لیے سامان کون لائے گا؟"

"ہر وقت کھانا، کھانا، کھانا، دماغ تو کھا چکی ہو میرا، اب کھانا کھانے کی کیا ضرورت؟"

"ٹھیک ہے نہیں جانا تو نہ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔بیٹھے رہو بھوکے۔"

"ہاں ہاں بھوکا ہی ٹھیک ہوں۔

تمہارے ہاتھوں سے بنا کھانا کھانے سے بھوکا رہنا ہی بہتر ہے میرے لیے۔"

☆☆☆

خودکشی

ایک دن جب میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا تو اچانک کہیں سے گولی کے چلنے کی آواز سنائی دی، آواز کافی صاف تھی اور قریب کی تھی واضح تھا کہ کوئی گولی چلی ہے، میں جلدی سے گھر سے باہر نکلا کیا دیکھتا ہوں کہ کُہرام مچا ہوا تھا بہت سارے لوگ جمع تھے اور کچھ رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ علاقے میں ایک نوجوان نے خود کو گولی مار کے خودکشی کر لی۔

تحقیق کرنے پر یہ بھی پتہ چلا کہ مذکورہ نوجوان جس نے خودکشی کی ہے وہ میرا ایک جاننے والا تھا، انتہائی ذہین اور خوبصورت نوجوان تھا ایل ایل بی کر رہا تھا اور اب اُس کا آخری ہی سال تھا پھر اس کو وکالت کی ڈگری مل جاتی اور وہ کچہری یا کہیں بھی اپنی پریکٹس کرتا اور روزی روٹی کما سکتا تھا لیکن جو قسمت کو منظور۔

مزید تحقیق پر پتہ چلا کہ اُس نوجوان کو ایک لڑکی پسند تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن اسکے ماں باپ اس کے خلاف تھے اور وہ اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور اپنی مرضی پر کرنا چاہتے تھے جو کہ نوجوان مذکور نہیں چاہتا تھا، والدین کو یہ منظور نہیں تھا اُنہوں نے اپنے بیٹے کو صاف انکار کیا اور کہہ دیا کہ ہم تمہاری شادی اِس لڑکی سے کبھی نہیں کر سکتے اور ساتھ میں اُس لڑکی

اور اُس کے خاندان والوں کو اُس کے سامنے برا بھلا بھی کہا۔ بس پھر کیا تھا لڑکے نے ٹھان لی کہ یا تو اسی لڑکی سے شادی کرے گا ورنہ زندگی ختم کر لے گا اور حتیٰ کہ اُس بات پر عمل بھی کر لیا اور یوں اپنی جان حرام طریقے سے ختم کر لی اور اپنے ماں باپ گھر والوں اور خصوصاً اپنی آخرت کو برباد کر لیا۔

قارئین یہ ہمارے گاؤں کا کوئی چوتھا یا پانچواں واقعہ ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی خبر کہیں سے کسی کی خودکشی کی ہوتی ہے خصوصاً اخبارات ایسی خبروں سے بھرے پڑے ہیں۔ لوگوں نے شاید مذاق بنا رکھا ہے زندگی کو، چھوٹی چھوٹی سی بات پہ اپنی جان لے لیتے ہیں اب اسی واقعہ سے کچھ مہینے پہلے ہی کی بات ہے کہ ایک اچھا خاصا نوجوان لڑکا جو پچھلے پانچ سال سے پاک آرمی میں تھا اچھا خاصا اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا روزی کما رہا تھا پھر اچانک چھٹی پر جب گھر آیا تو اس کا گھر میں ایک چھوٹی سی بات پہ جھگڑا ہو گیا یوں اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جا کر ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔

اسطرح سے کئی واقعے ہوتے رہتے ہیں آج کل روز اخباروں میں بھی یہی دکھاتے ہیں کہ فلاں جگہ فلاں نے خودکشی کی فلاں شہر میں فلاں نے خودکشی کر لی، وہ واقع تو آج بھی میں نہیں بھول سکتا جب بھی یاد آتا ہے تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے وہ جب ایک شخص نے دوسرے سے اُدھار لے لیا لیکن وہ وقتِ مقررہ پر واپس نہیں کر سکا کیوں کہ اُس کی جو اُمید تھی کہ اُس کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے مگر وقت تو گزر گیا لیکن اُس کے حالات مزید بگڑ گئے اور وہ اُدھار کی رقم واپس نہ کر سکا لیکن قرض خواہ تو اُس سے بار بار تقاضا کرتا رہا کہ اُس کا اُدھار واپس کرے اور وہ اُسے بار بار اُدھار واپسی کے تقاضے سے کافی تنگ آ گیا اور اُسے بظاہر جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو اُس نے جانوروں کے چارہ کاٹنے والی مشین میں اپنا سر رکھ کے خود ہی اپنی گردن کاٹ ڈالی۔ افسوس صد افسوس اور یوں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم اور اپنی نوجوان بیوی کو بیوہ کر دیا۔

ایک اور واقعہ یوں ہوا کہ ایک تین بچوں کے باپ نے بے روزگاری کے عالم میں جب عید سر پر آ گئی تو اُس کے بچے اُس سے نئے کپڑوں کا تقاضہ کرنے لگے جب کہ اُس کے پاس اُن کے معصوم سوالوں کا کوئی جواب نہ بن پایا تو ایک دن وہ اپنے بچوں کو لے کر دریا پر سیر کرانے کے بہانے دریا کے پل کے عین وسط میں لے گیا اور اپنے تینوں بچوں سمیت دریا میں کود کر خود کو اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو ختم کر لیا۔ اُس نے اپنی دنیا اور آخرت تو خراب کر ہی لی تھی لیکن اُن معصوم بچوں کا کیا قصور تھا اُنہوں نے تو ابھی ٹھیک سے دنیا بھی نہیں دیکھی تھی کیا معلوم کچھ عرصہ بعد اُن کے حالات ٹھیک ہو جاتے۔ کیا معلوم وہ جیسے تیسے بڑے ہو کر اپنی اچھی زندگی گزارتے اُس مرنے والے نے کچھ بھی نہ سوچا۔ کیا زندگی اتنی سستی ہے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہم اپنی جان دے دے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں، بلکہ زندگی تو اللہ کی ایک خاص امانت ہے اس میں لاکھ آزمائشیں آتی ہیں لاکھ امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے، صبر کا دامن پکڑے رہنا پڑتا ہے وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا آج اگر حالات خراب ہیں آج غربت ہے افلاس ہے مسائل ہیں لیکن اپنے رب سے ہمیشہ اچھی اُمید رکھنی چاہیے ایک نہ ایک دن ایسا آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ آج اُس کے حالات پہلے سے اچھے ہیں ہمیشہ رب کا شکر ادا کرنا چاہیے ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا بھی فرض ہے کہ اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں کے حالاتِ زندگی پر نظر رکھیں، یاد رکھیں کہ اللہ پاک نے اگر تمہیں اتنا زیادہ دیا ہے تو اس لیے کہ تم اپنے سے کم درجے کے لوگوں کا خیال رکھو، اپنی نیک کمائی میں سے اُنہیں بھی دو جن کے حالات ٹھیک نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی بڑی زمینیں ہیں، باغات ہوتے ہیں، فصلیں سال بھر چلتی رہتی ہیں ہر چیز وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے لیکن وہ اپنے سے کم تر لوگوں غریب لوگوں یا مفلس لوگوں پر خرچ نہیں کرتے ایسے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غریب اور مفلس لوگوں کا بھر پور خیال رکھیں تا کہ کسی کے گھر خودکشی کی نوبت نہ آئے۔

☆☆☆

”لیجئے صاحب اِس کو چائے پانی سمجھ کر لے لیجئے ، مجھے یہاں رکھنے سے نہ آپ کا فائدہ ہوگا اور نہ میرا، البتہ آپ کو پرشانی ہوگی آپ کو میرے اُوپر نگرانی کرنی پڑے گی ، لیجئے صاحب اس سے آپ بھی خوش میں بھی خوش۔“ وہ یہ سب باتیں غور سے سُنتا رہااور پر مسکرا کر کہا۔

”جاؤ انجم !تم بھی کیا یاد رکھو گے اس بار پھر چھوڑ رہا ہوں، لیکن تم بھی ذرا دھیان رکھنا یہاں آنا جانا تو تمہارا روزمرہ کا کام بن چکا ہے۔“

”کیا کروں صاحب اپنی عادت سے مجبور جو ہوں۔“ انجم نے یہ کہ کر اپنے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی بندھ مٹھی میں کچھ پیسے تھانے دار کے ہاتھ میں تھما دیئے ،اور پھر بولا :” چلتا ہوں صاحب اللہ حافظ۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے لیکن ہر بار ایسا نہیں چلے گا تم بھی کچھ ہمارا خیال کرو، پتہ ہے کتنی مہنگائی بڑھ گئی ہے ہمارا ابھی گھر بار ہے بال بچے ہے ہر بار اتنا دینے سے کام نہیں بنے گا۔“

”جی جی ٹھیک ہے صاحب۔“ یہ کہہ کر انجم جیل سے چل دیا اور اس بار پھر بغیر سزا کاٹے بھری ہو گیا اور پھر اپنے روزمرہ کے چوری لوٹ مار کے دھندے میں لگ گیا کیونکہ اُسے اس کام میں بڑا مزہ آتا تھا اور اس سے بغیر زیادہ مشقت کے وہ اچھے خاصے پیسے بنا تا تھا اور اُسے پکڑے جانے کی

پریشانی بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ ہر بار بڑے آرام سے جیل سے فرار ہو جاتا۔ ابھی تک کئی بار گرفتار ہونے کے باوجود بھی اُسے ایک دن بھی قید کی سزا نہیں ہوئی۔ اسلیے اب تک کا اُسکا دھندا ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

کچھ ہی دن میں اُس نے بڑے بڑے ہاتھ مارے، بڑی بڑی ڈکیتیاں ڈالیں اور اس بار تو وہ گرفتار بھی نہیں ہوا۔ اُس کو اب چوریاں کرتے کرتے یہ بھی تجربہ حاصل ہوا کہ پولیس سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اب وہ پہلے ہی سے جہاں ڈاکا ڈالنے جاتا اُس جگہ کے تھانے دار کو اپنا حصہ دے دیتا۔ اس سے انجم کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ وہ آرام سے چوری کرتا اور وہاں سے رفو چکر ہو جاتا تھا۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد پولیس جائے واردات پر پہنچ جاتی۔ پولیس تو خیر ویسے بھی کبھی وقت پر نہیں پہنچتی لیکن جب بروقت نہ آنے کے پیسے بھی مل جائیں پر تو چاہ کر بھی وہ وقت پر نہیں آ سکتی۔

بس اب کیا تھا انجم خود کو بڑا ہوشیار ماننے لگا اور اُس نے اس بار ایک بڑے بینک میں ڈکیتی ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس بار اُس نے کچھ چار پانچ آدمیوں کی ٹیم بھی بنائی۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا ڈاکا تھا وہ یہ سب اکیلے نہیں کر سکتا تھا اُس کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام کرنا پڑا اور ایک ٹیم بنائی۔

کچھ دن تک وہ چوری کا پروگرام بناتے رہے ادھر اُدھر سے سب خبریں اکٹھی کیں، اور اگلے روز ہی ڈاکا ڈالنے روانہ ہو گئے، اب تک اپنے پورے پروگرام کے مطابق سب کچھ اچھا چل رہا تھا۔ اُس کے دو آدمیوں نے گاڈز پر بندوق تان دی اور انجم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بینک میں گُھس گیا اور پیسوں سے اپنے اپنے بیگ بھر لیے۔ اب وہ واپس جانے کے لیے نکلے۔ ادھر گارڈز کی ڈیوٹیاں تبدیلی کا وقت ہو چلا تھا۔ انہوں نے گوالیاں چلانی شروع کر دی۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ اسی گولا باری میں پولیس بھی آ گئی۔ وہ سب زیادہ دیر ٹک نہ

سکے۔ پولیس نے انجم کے سب دوستوں کو پکڑ لیا۔

یہ دیکھ کر کہ میرے سب ساتھی پکڑے گئے، انجم گھبرا گیا اور بھاگنے کی کوشش کی اُس کو بھاگتے دیکھ کر ایک پولیس والے نے گولی چلادی اور گولی سیدھے اُس کے سر میں جا لگی اور اُس نے وہی دم توڑ دیا۔

☆☆☆

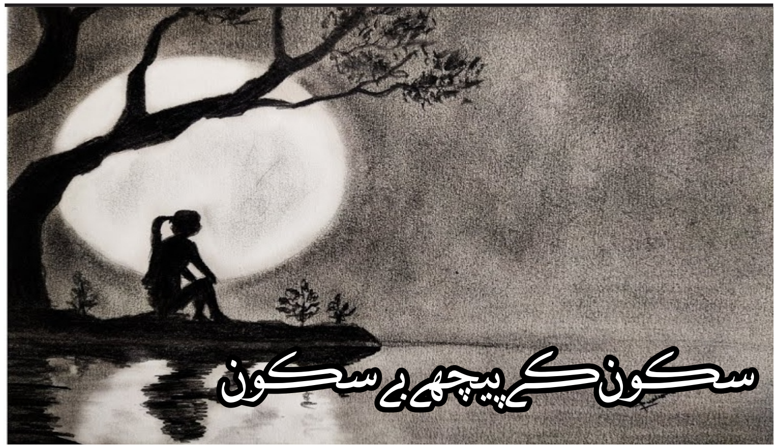

جیب نفسا نفسی کا دور آ گیا ہے ایک دوڑ لگی ہوئی ہے پیسہ کمانے کی، امیر سے امیر بننے کی، کوٹھیاں، بنک بیلنس، زمینیں ہوں، جائیدادیں ہوں اور وہ بھی ایسی کہ ان میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے، یہ ہیں آج کے انسان کی پتا۔ کسی کو کسی کا کچھ خیال نہیں انسان انسان کو روندتا ہوا آگے نکلنا چاہتا ہے اور اگر کبھی استفسار کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ میاں یہ بھاگ دوڑ سکون حاصل کرنے کے لیے ہے یہ پیسہ، یہ زمینیں، یہ جائیدادیں ہوں گی تو سکون ہوگا وگرنہ زندگی بے سکون ہو جاتی ہے۔ مگر یہی بے سکونی انہیں سکون سے نہیں رہنے دیتی۔ رات کی نیندیں تک حرام ہوتی ہیں ایسے لوگوں کی۔

دوسری جانب غریب تو ویسے ہی سکون میں ہوتا ہے، نہ اس کے پاس بینک بیلنس ہے، نہ کوٹھی بنگلے، روکھی سوکھی کھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے والا انسان ہی اصل سکون میں ہوتا ہے مگر اپنی دولت میں روز بروز اضافہ کرنا اور کرتے ہی رہنا اور اپنے آس پاس کے غرباء پر نظر نہ رکھنا، رات دن آگے سے آگے بڑھنے کی لگن میں یہ انسان اپنا سکون خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ انسان جب حرس و ہوس مین پڑ جاتا ہے تو پھر سکون اس سے کوسوں دور چلا جاتا ہے تھوڑے پر اس کا گزارا نہیں ہوتا ایسا انسان مال و دولت میں تو مالا مال ہوتا ہے مگر سکون کے کی دولت سے

کنگال ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے اگر کسی کو دولت و جائیداد سے نوازا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو بھی دے تا کہ اس کو سکون نصیب ہو۔

اپنے آس پاس کے ماحول پر نظر رکھے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، کوئی مکان نہیں ہوتا، دو وقت کی روٹی کمانا ان کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، آج کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا اور مایوسیاں ان کے مقدر میں ہوتی ہیں مگر جب وہ سوتے ہیں نیند کرتے ہیں تو سکون کی نیند انہیں نصیب ہوتی ہے دوسری طرف جائز ناجائز دھندے کرنے والے بے سکونی میں پڑے ہوتے ہیں چاہتے ہیں کہ سکون جہاں سے ملے خرید کر لیں مگر سکون کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کسی دوکاندار سے پیسے دے کر طلب کی جائے۔

سکون ملتا ہے عبادت سے، مخلوقِ خدا کی خدمت سے، انسانوں سے محبت کرنے سے مگر ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے اور دنیا میں سکون و آشتی کے لیے انسان کو انسان ہونا پڑتا ہے وگرنہ یہی انسان سکون سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ جاتے ہیں مگر سکون کہیں سے نصیب نہیں ہوتا۔

☆☆☆

دو پیار بھرے دلوں کے درمیان دراڑ ڈالنے، دیواریں اُٹھانے کے لیے تیار بیٹھی یہ دنیا عاشق و معشوق کو جینے نہیں دیتی۔ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی ماہیوال کی محبت کی داستانیں مشکلوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے بھری پڑی ہیں لیکن وہ سچے عاشق اپنے اپنے قدور میں اپنے اپنے علاقے میں محبت کو امر کر گئے۔ اُنہوں نے ہمت نہ ہاری۔

آج کے حالات بھی کچھ کم نہیں، آج بھی ایسا ہی ہے محبت کرنے والے، محبت کا جذبہ رکھنے والے کم نہیں ہیں۔ آج بھی پیار میں ایک دوسرے پر جان قربان کرنے والوں سے دنیا بھری پڑی ہے مگر ان کے مدمقابل ظالم سماج آج بھی اپنے درمیان کئی چاچا قیدو رکھتا ہے۔

آج بھی دو پیار کرنے والے دلوں میں دراڑ ڈالنے والے ہمہ وقت اسی کام میں مصروف رہتے ہیں یہ پتھر دل، عاشقوں کا جینا حرام کرنے والے ظالم لوگ آج بھی موجود ہیں۔ اگر یہی بیدردی، یہی بغض و کینہ جاری و ساری رہا تو رہتی دنیا تک پیار محبت کرنے والوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پیار محبت کرنے والے دل بہت کم ہی ایک ہوئے ہیں، سچی محبت کے راستے میں خار ہیں، صحرا ہیں، سمندر پار کرنے پڑتے ہیں، پیار محبت کی راہ میں گڑھے کھودے

جاتے ہیں، خار بچھائے جاتے ہیں، کیوں کہ یہ ظالم سنگدل زمانہ کبھی دو دلوں کو ایک ہونے ہی نہیں دیتا۔

آخر کیا بگاڑا ہے پیار کرنے والوں نے سماج کا؟

کیا نقصان ہوتا ہے سماج کا؟

آخر کیوں فرعون صفت لوگ پیار بھرے دلوں کو نہیں ملنے دیتے۔؟

جبکہ سب جانتے ہیں کہ محبت تو ایک انمول جذبہ ہے۔ محبت بے آب و گیاہ وادیوں میں پھول کھلا دینے والا جذبہ ہے۔ محبت صحراؤں کو ہرا بھرا کر دینے والا جذبہ ہے مگر کون ہے جو دو دلوں کا دکھ درد سمجھے۔ بات کرتے ہیں ان بیچاروں کی جو یکطرفہ محبت کرتے ہیں، اُف اللہ، ہائے اللہ، یہ بے چارے چلتے پھرتے مریضانِ عشق، سماج نے ان کا بھی جینا حرام کیا ہوا ہے، یہ بے چارے ہمہ وقت موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ اپنے محبوب سے اپنی محبت کا اظہار کر سکیں۔ مگر جب موقع ملتا ہے تو یہ ظالم سماج یہاں بھی روڑے اٹکانے سے باز نہیں آتا یہ دنیا یہاں بھی رقیب رُوسیہ کا کام کرتی ہے جب کسی کو پتہ چلے کہ فلاں مجھ سے محبت کرتا ہے تو پھر اُس کے امتحانات شروع ہو جاتے ہیں۔ فرمائشیں شروع ہو جاتی ہیں کیوں اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص میرے بنا جی نہیں پائے گا جو کہا جائے گا یہ کر کے دکھائے گا خواہ آسمان سے تارے توڑنے کا حکم ہی کیوں نہ صادر ہو۔ یک طرفہ محبت کرنے والے ہمیشہ گُھٹ گُھٹ کر جیتے رہتے ہیں، دل ہی دل میں پیار کو پالے رہتے ہیں اور ہمہ وقت اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ ان کے محبوب کی جانب سے کوئی اشارہ تو ملے کوئی حکم تو آئے کوئی تو فرمائش آئے اور یہ اسے بِنا چُوں چراں کیے مان لیں۔ چاہے سولی پر چڑھ جانے کی فرمائش ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔ عشق کا سایہ جس پر پڑ جائے پھر وہ دنیا کا نہیں بلکہ کسی الگ سیارے کا باشندہ بن جاتا ہے اور جب کسی یک طرفہ محبت والے کو شک پڑ جائے کہ دوسری طرف سے بھی اسے چاہا گیا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں

رہتی وہ من ہی من میں جنگلوں، پہاڑوں، وادیوں میں ناچتا گاتا پھرتا ہے۔ بازار میں بھی یہ سوچ کر اکڑ کر چل رہا ہوتا ہے کہ جیسے اس کا محبوب اسے کسی طرف سے دیکھ رہا ہے مگر جونہی زمانے کو ان کے پیار کی بھنک پڑتی ہے تو زمانہ جیسے منظم انداز میں راہ میں حائل ہونے کو تیار کھڑا ملتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر کب تک دو پیار بھرے دلوں کے درمیان مسائل پیدا کرنے والے، دیواریں کھڑی کرنے والے، کانٹے بچھانے والے اور ٹانگیں کھینچنے والے موجود رہیں گے کیا یہ دنیا کا دستور غلط نہیں ہے۔

تُو محبت میں ڈھونڈتا خوشی ہے
زیب تُو بھی عجیب آدمی ہے

☆☆☆

مفلسی

ارسلان اگرچہ ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتا تھا مگر اپنی ذہانت اور تعلیم میں لگن کی بدولت یونیورسٹی میں داخلہ پا چکا تھا۔اس کے والد کی شبانہ روز محنت اور خون پسینے کی کمائی سے اس کے اخراجات بمشکل پورے ہو رہے تھے مگر وہ جانفشانی سے محنت کر کے اپنی منزل کی جانب گامزن تھا گھریلو حالات اور اپنے متوسط طبقے سے ہونے کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم میں کافی سیریس تھا اور یونیورسٹی میں بھی وہ بہت کم گو اور سنجیدہ سٹوڈنٹ جانا جاتا تھا اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان ارسلان ہمہ وقت پڑھائی میں مصروف رہتا۔

یونیورسٹی کے دیگر سٹوڈنٹس جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں ارسلان کی کم گو شخصیت کی وجہ سے اس سے زیادہ تر دور دور ہی رہتی تھیں۔ یونیورسٹی میں عرصہ حیات یوں ہی رواں دواں تھا کہ ایک دن ارسلان ہی کی کلاس میڈ مہک جو ارسلان کی سنجیدگی اور کم گوئی سے شاید متاثر تھی کافی دنوں سے ارسلان کے ارد گرد گھوم رہی تھی کہ کسی طرح اس سے بات چیت کی جائے پھر ایک دن مہک اور ارسلان آپس میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے ان کی بات بات پر ہنسی دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کا ثبوت تھی اب ارسلان تبدیل ہو چکا تھا اس کو ایک خوبصورت لڑکی خود بخود ہی مل گئی تھی۔اب ارسلان کے چہرے پر تازگی سی نظر آنے لگی تھی۔اُس کا چہرہ دلکش معلوم ہوتا تھا جب وہ

مہک کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوتا۔مہک بھی ناز و انداز میں کچھ کم نہیں تھی،خوبصورت، حسین اور دلکش مسکراہٹ کی حامل مہک اب زیادہ تر ارسلان کے ساتھ ہی نظر آتی،ارسلان اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے اتنی خوبصورت لڑکی سے دوستی نصیب ہوئی۔

اب جب مہک نظر نہ آتی تو ارسلان اداس ہو جاتا۔ پڑھائی میں بھی دل نہ لگتا گویا وہ اسے اپنا دل دے بیٹھا تھا،ارسلان اب مہک سے شدید محبت کرنے لگا تھا وہ اُس کی محبت میں پاگل سا ہو گیا تھا۔وہ محبت کی حماقت کر بیٹھا تھا مگر اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا کیوں کہ محبت کی نہیں جاتی۔محبت تو ہو جاتی ہے۔یہ شعلہ خود بھڑک اُٹھتا ہے،بھڑکایا نہیں جاتا۔اُدھر مہک کو بھی شاید ارسلان سے محبت تھی۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا،دونوں کی دوستی محبت میں تبدیل ہو چکی تھی ارسلان اور مہک دونوں ایک ساتھ ہوتے تو دیگر کلاس فیلوز بھی حسد کی نگاہ سے دیکھتے ان کی دوستی کا چرچا پوری یونیورسٹی میں تھا۔ارسلان واقعی خوش قسمت تھا کہ اسے بغیر منت،بغیر مشقت،بغیر کوشش کے ایک خوبصورت ساتھی مل گیا تھا اسی لیے اب وہ اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچنے لگا وہ اسے پرپوز کرنا چاہتا تھا،اپنا مستقل جیون ساتھی بنانے کے لیے۔وہ ایک دو بار باتوں باتوں میں اظہار کرنے ہی والا تھا کہ ڈرامائی طور پر کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا کہ بات ادھوری رہ جاتی،مگر وہ ڈٹا رہا۔کوشش کرتا رہا اور آج اس نے ٹھان لی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنے دل کی بات کہہ کر ہی دم لوں گا۔میں آج مہک سے لازمی شادی کی بات کروں گا۔وہ پُراُمید تھا کہ مہک لازمی اس کی بات مان لے گی اور اس بات کا ثبوت اس کی حد سے زیادہ محبت تھی۔

شام کو جب مہک اور ارسلان اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو ارسلان نے ہمت کر کے دل کی بات کہہ ہی دی۔مہک میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں،اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔۔۔مہک کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

شادی ؟ کیا مطلب ؟ مہک بولی ۔تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ۔ یہ ہے یہ سب ؟ میں تمہاری دوست ہوں صرف دوست ۔

ارسلان بولا :نہیں دماغ خراب نہیں ہے بلکہ میں تمہیں پرپوز کر رہا ہوں ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔اپنی محبت کو دوام بخشنا چاہتا ہوں ۔ نہ کہ ٹائم پاس کرنا چاہتا ہوں ۔

یہ بات سنتے ہی مہک بھڑک اُٹھی ۔بس اس سے آگے ایک لفظ مت بولنا ۔ میں تمہیں صرف ایک اچھا دوست سمجھتی ہوں ۔تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا ۔تمہاری اوقات ہی کیا ہے ؟ میں اتنے بڑے خاندان کی اتنے امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اور تم ۔۔۔۔۔۔؟ غریب بلکہ انتہائی غریب خاندان ، کیا کبھی زمین اور آسمان بھی ایک ہوئے ہیں بھلا ، نہیں بالکل نہیں ، میں تم سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی ۔ پھر وہ غصے میں ارسلان کو بہت کچھ سُنا گئی ، غریب ، اپنی شکل دیکھی ہے ، آئندہ مجھے شکل مت دیکھانا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔۔مہک یہ سب کچھ بول کر چلی گئی لیکن ارسلان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا وہ غمگین ہو کر نیچے بیٹھ گیا اُس کے الفاظ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے ۔غریب ، مفلس ، اوقات ، وہ سوچ رہا تھا کہ کیا غریب کو پیار کرنے کا کوئی حق نہیں ؟ کیا غریب کا دل نہیں ہوتا ؟ بس ایک ہی لمحے میں ساری کہانی اُلٹ ہو گئی ۔ گویا ارسلان کی دنیا ہی لُٹ گئی ۔

انسانیت کا نوچتی ہے دھڑ یہ غریبی
گویا مصیبتوں کی بھی ہے جڑ یہ غریبی

☆☆☆

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں انسان کس قدر ناشکرا ہے اللہ پاک نے اسے بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے مگر انسان ہے کہ ناشکری ہی کیے جاتا ہے آپس میں دوریاں بڑھا رہا ہے کہیں کوئی کسی کی ٹانگ کھینچ رہا ہے تو کوئی کسی کو بدراہ کر رہا ہے مگر ذرا دیکھیے تو " جگنو" جگنو! ایک چھوٹا سا پتنگا اپنی دُم پر روشن چراغ اُٹھائے راتوں کو اندھیری راہوں پر ایسے گھوم رہا ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو اپنی ننھی سی روشنی سے راستہ دکھا رہا ہو یہ چھوٹا سا پتنگا بھی راستہ دکھا رہا ہے کسی کو گمراہ تو نہیں کر رہا مگر انسان جو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہے آج کیسی گمراہیوں میں دھنسا ہوا ہے جسے دیکھو دوسرے کو گمراہ کرنے کے چکروں میں لگا ہے ۔ دھوکہ دینے میں ، فراڈ کرنے میں ، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں ، حرص ، ہوس میں ڈوبا یہ" انسان" چاہتا ہے سب کچھ اُسے مل جائے اتنی بڑی بڑی جائیدادیں رکھنے کے باوجود اتنی بہت ساری دولت رکھنے کے باوجود اور زیادہ کے چکروں میں لگا ہے اور ان کوششوں میں اگر اسے کسی کو دھکا ہی کیوں نہ دینا پڑے لوگوں کو گمراہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے کسی کو غلط راستے پر ہی کیوں نہ لگانا پڑے یہ انسان باز نہیں آتا یہ کیسا انسان ہے آج کا ، اپنے مالک سے بے وفائی کرنے والا ، اپنے زیرِ سایہ ملازمین پر بے رحمی سے پیش آنے والا ، کُتا بھی کہیں سے ایک مرتبہ روٹی کا ٹکڑا کھا لے تو وہ اُسی کا ہو کر رہ جاتا ہے مگر انسان

جہاں سے کھاتا ہے وہیں چھید کرنے پر لگ جاتا ہے۔

جگنو ایک چھوٹا سا پتنگا مگر اس نے یہ نہیں دیکھا کہ میں تو بالکل چھوٹا ہوں میں کسی کے کیا کام آؤں گا، میرا چھوٹا سا لیمپ بھلا کسی کو کیا روشنی دکھائے گا وہ پھر بھی گامزن ہے راستے دکھانے میں، بھلائی کے کاموں میں، بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لگانے میں،

میں سوچتا ہوں کیا انسان ایسا نہیں ہوسکتا اگر انسان بھی ایسا ہو جائے تو پھر وہ اللہ ہم پر کیوں مہربان نہ ہو اللہ پاک تو کب سے ہمارا انتظار فرما رہے ہیں کہ کب انسان سیدھے راستے پر آئے کب وہ دھوکہ، فراڈ اور بے راہ روی سے باز آئے اور میں (اللہ) اسے نوازوں، ہدایت دوں اور بالآخر جنت میں داخل کروں۔

اللہ پاک ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔(آمین)

کاش رب مجھ کو بنائے جگنو
جس طرح راستہ دکھائے جگنو

☆☆☆

سرِ عام، دن دیہاڑے چوہدری وزیر کے بندوں نے مراد علی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ آسمان گرا، نہ زمین پھٹی، قاتل بڑی تسلی سے اُسے مارنے کے بعد دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے بغیر فرار ہوگئے۔ کافی لوگ چشم دید گواہ تھے مگر مجال ہے کہ کوئی بولتا یا روکتا۔ کسی نے کوئی قدم نہ اُٹھایا۔ کسی میں جرات نہ تھی کہ پولیس کو اطلاع کرتا، یا اس اندوہناک قتل کی گواہی دیتا۔ اور تھا بھی ایسا کہ چوہدری وزیر کے خلاف قتل کی گواہی دینا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور کون اپنی موت چاہتا ہے۔

اگرچہ مراد علی کوئی لاوارث نہ تھا اور نہ ہی کوئی بُرا انسان وہ ایک غریب کسان تھا جس کی زمین پر چوہدری وزیر ایک مدت سے قابض تھا مراد علی کا باپ قبضہ چھڑانے کی کوشش کرتے کرتے قبر میں جا پہنچا اور اب مراد علی کی باری تھی۔ مراد علی نے ہمت کر کے عدالتِ انصاف کا در کھٹکایا تھا اور مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ چوہدری وزیر کے کارندوں نے اُسے پہلے کافی دھمکایا، سمجھایا، حتیٰ کہ کئی بار زدوکوب بھی کیا۔ مگر مراد علی ڈرنے والا نہ تھا وہ ڈٹا رہا اور عدالت سے انصاف لینے جا پہنچا۔ پہلی پیشی کے بعد چوہدری وزیر کے غنڈوں نے اُسے عدالت سے واپس گاؤں آتے ہوئے راستے میں ہی گولیوں کے وار کر کے مار ڈالا اور گاؤں میں کوئی بھی اس کا ہمدرد نہ نکلا۔

چوہدری وزیر ایک فرعون صفت شخص تھا اُس نے اور بھی کئی غریب کسانوں کی زمینوں

پر قبضہ کیا ہوا تھا اور کئی غریب کسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا علاقے کے لوگ اُس کے خوف سے کانپتے تھے اور اُس کے خلاف کوئی بات تک نہ کرتے، کسی میں اتنی جرات نہ ہوتی کہ اس درندہ صفت انسان کے خلاف کوئی بات کر سکتا اور جو کوئی ایسا کرتا اس کا انجام موت ہوتا۔ مگر مراد علی نے یہ جرات کی اور پھر اُس کا انجام بھی موت ہوا۔ کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ درندہ صفت آدمی کے خلاف کھڑا ہوتا کس میں اتنی مجال کہ وہ اس دجال کے خلاف آواز اُٹھاتا۔

اب ایک مرتبہ پھر چوہدری کا قبضہ برقرار رہا۔ اُدھر عدالت سے مقدمہ خارج ہونے ہی والا تھا کہ مراد علی کی بیوہ سکینہ ہمت کر کے عدالت جا پہنچی اور نہ صرف مقدمے کی پیروی کرنے لگی بلکہ اپنے شوہر کے قتل کا مقدمہ بھی درج کرا دیا۔ اُس نے عزم کیا کہ کچھ بھی ہو وہ قاتل کو سزا دلوا کر اپنی زمینوں کا قبضہ بھی چھڑوا لے گی۔ اُس نے اپنے زیور وغیرہ بیچ باچ کر ایک اچھا وکیل کیا اور پیشیوں پر پیشیاں بھگتنے کے بعد بالآخر اللہ نے اُس کی سُن لی۔ اور وہ دن بھی آ گیا جب کیس کا فیصلہ ہونا تھا۔ اُس کی جیت صاف نظر آ رہی تھی اور چوہدری کی شکست مقدر تھی۔ آخری پیشی پر سکینہ نے اپنا آخری گواہ پیش کرنا تھا۔ اسی گواہ کی گواہی پر کیس کا فیصلہ متوقع تھا۔ عدالت لگ گئی، جج نے گواہ پیش کرنے کا کہا، گواہ پیش ہو تو گیا مگر۔۔۔ یہ کیا گواہ اپنے بیان سے ہی مُکر گیا اور اُلٹا چوہدری کے حق میں گواہی دے دی۔ پھر کیا تھا جیتی ہوئی بازی ہارنی پڑ گئی سکینہ کو۔

ہوا کچھ یوں کہ آخری پیشی سے ایک دن قبل ہی چوہدری نے اس گواہ کو بہت سارا پیسہ اور زمین کا لالچ دے کر خرید لیا اور پھر وہی ہوا عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا۔

ایسے بے ضمیر ہیں ، ایمان بیچتے ہیں
چمک دمک کو دیکھ کے بیان بیچتے ہیں

☆☆☆

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا

وہ بھول بھال چکا تھا دنیا کی چکا چوند یوں میں گم، زندگی کے اُتار چڑھاؤ نے اُسے بھلا دیا تھا کہ اُس نے بھی کبھی محبت کی تھی۔ مگر آج جب وہ سٹی سروس کی بس میں سوار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا تو اچانک اس کی نظر رابیل پر پڑ گئی وہ چونکا۔۔۔ رابیل۔۔۔؟ اور پھر اُس نے جلدی سے بس رکوائی اور نیچے اُتر گیا اب وہ رابیل کا پیچھا کرنے لگا۔

رابیل اونچے لمبے قد کی خوبصورت لڑکی، آنکھوں پر عینک چڑھائے، آدھے منہ پر نقاب، تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی، بازار کی جانب جاتی ہوئی سڑک پر گامزن تھی۔ اسد اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ شاید اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ جلد ہی ایک ریسٹورنٹ کے اندر چلی گئی۔ وہ بھی وہاں پہنچا اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر دیکھنے لگا۔ ریسٹورنٹ میں کاؤنٹر کے نزدیک پینٹ شرٹ میں ملبوس نوجوان شخص اُسے دیکھ کر چونکا اور کہا۔۔۔ ہائے رابیل! تم یہاں؟

کیوں اب میں یہاں بھی نہیں آ سکتی۔۔۔؟ رابیل نے کہا۔۔۔

کیا میں اس ریسٹورنٹ کی مالک نہیں ہوں؟

ارے نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔۔۔ مگر تم بتا کر بھی آ سکتی تھی یہاں ملازمین کیا سمجھیں گے وہ نہیں جانتے کہ تم میری بیوی ہو۔ چلو آ ہی گئی ہو تو آؤ بیٹھتے ہیں۔ وہ بولا۔

رابیل کہنے لگی چلو اب فضول باتیں چھوڑو، مجھے کافی بھوک لگی ہے کچھ منگاؤ۔

یہ کہتے ہوئے دونوں آگے بڑھے اور ریسٹورنٹ میں ہی بنے ہوئے ایک کیبن میں چلے گئے۔

اسد جو قریب ہی کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ رابیل سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ صورت حال دیکھ کر اتنا مایوس ہوا جیسے کوئی بجلی سی اس کے تن بدن میں سرائیت کر گئی ہو۔ اس کی خواہش حسرت بن کر رہ گئی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا، ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا گویا پسپائی اختیار کرنے لگا وہ مایوس لوٹ رہا تھا ماضی کی فلم اس کے ذہن میں چل رہی تھی ایک وہ بھی دن تھا جب رابیل اور اس کی دوستی تھی۔ کافی مضبوط دوستی، وہ یونیورسٹی میں تھے جب دوسرے لڑکے ان کی دوستی سے حسد کرتے تھے اور وہ دونوں خوش گپیوں میں لگے رہتے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں بھی ہو چکی تھیں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر اچانک رابیل یونیورسٹی آنا بند ہو گئی اور روزانہ ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہوا۔ اب وہ فون پر بات کرنے لگے روزانہ بات ہوتی، رابیل نے بتایا کہ وہ غیر ملک جا رہی ہے اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ روکنا چاہتا تھا پر نہ روک سکا، وہ چلی گئی۔ اسد یہیں رہ گیا وہ باہر نہ جا سکا اپنے نامساعد حالات کی بنا پر۔ غیر ملک میں بھی فون پر بات ہو جاتی تھی مگر اب کبھی کبھی، اب بھی ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدوں کی تجدید ہونے لگی۔

دونوں ہی اپنے اپنے عہد پر قائم تھے پھر اچانک رابیل نے فون اُٹھانا ہی بند کر دیا۔ ہجر نے وصل پر غلبہ پا لیا تھا ایک دن گزرا۔۔۔ دو دن گزرے۔۔۔ مہینے اور پھر سال۔۔۔ دو سال۔۔۔ تین سال۔۔۔ رابیل کے رابطہ میں نہ ہونے سے اسد بھی آہستہ آہستہ اُسے بھولنے لگا۔ غمِ روزگار ہاں "غمِ روزگار" سب کچھ بھلا دیتا ہے اور پھر وہ غمِ روزگار میں کھو گیا آج دو تین سال بعد اُسے اچانک سے رابیل نظر آئی تو وہ چونکا اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی اس کے محبت کے جذبے پھر سے انگڑائی لینے لگے اور وہ بس سے اُتر کر اس کے پیچھے پہنچ گیا وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا اپنی

محبت کی تجدید کرنا چاہتا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ میں اس کے پیچھے گیا تاکہ کسی ٹیبل پر بیٹھ کر دونوں اکٹھے چائے پی سکیں اور اپنے ماضی کو یاد کر سکیں۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا اور نہ جانے کیا کیا مگر یہ کیا وہ تو اپنے شوہر سے ملنے ریسٹورینٹ گئی تھی۔ یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ اُس نے شادی کر لی تھی۔

اُسے اپنے گرد اندھیرا محسوس ہونے لگا اسد پر گویا قیامت کی گھڑی تھی۔ کیا سوچا تھا، کتنے عہد کیے تھے ساتھ جینے مرنے کے، اس نے اُن دونوں کی گفتگو سن لی تھی اور اب وہ ریسٹورنٹ سے کافی دور آ چکا تھا پیدل چلتا ہوا اُس کے ذہن پر یہی شعر سوار تھا۔

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆☆☆

غریب کی عید

بازاروں میں رش حد سے بڑھ گیا- بوڑھے بچے نوجوان مردعورت ہرکوئی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہرطرف رنگینی پھیلی ہوئی تھی۔کہیں خوبصورت پھول تو کہیں کھلونے تو کہیں رنگ برنگی چوڑیاں آویزاں تھیں۔ دل کو مسرت فراہم کرنے کے لیےطرح طرح کی اشیا موجود تھیں۔

روڈ بازار دکانیں کچا کچ بھری ہوئی تھیں۔حلوائی کے دکان پہ جاؤ تو وہاں رش نائی خانے جاؤ تو وہاں رش، اتنا رش بڑھ گیا ہے کہ جو کام بندہ دس منٹ میں کرتا تھا اب وہی کام آپ دو گھنٹے میں بھی نہیں کر سکتے تھے اتنا رش جو بڑھ گیا ہے دن رات شاپنگ کرتے کرتے بھی لوگوں کے ضروریات ختم نہیں ہو رہے بازار ہر روز تھمنے کے بجائے دن بدن گرم ہوتا جا رہا ہے۔

عید کے دن قریب آرہے ہیں اتنی بھیڑ ہے کہ راستوں پہ چلنا اب اتنا مشکل ہے کہ ہر کوئی دوسروں کو یہاں وہاں دھکیل کے خود کے لیے راستہ بنا رہا ہے ایک طرف خوشی ہے تو دوسری طرف اس رش اور ہر دکان پہ انتظار کرنے نے لوگوں کا بلڈ پریشر ہائی کیا ہوا ہیں ۔

صبح ہوئی کل عید کا دن ہے میں جلدی جلدی اُٹھا منہ ہاتھ دھولیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ مجھے آج بہت کام تھا درزی سے بہن بھائیوں کے کپڑے لانے ہیں۔حلوائی کے دکان سے مٹھائیاں لانی

ہے اور اسطرح اور بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے کام ہے یہ سب سوچ کر میں نے جلدی جلدی کھانا کھالیا اور گھر سے بازار کی طرف نکل پڑا۔

رستے میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں ہر روز بازار تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگاتا تھا اور آج میں آدھے گھنٹے میں اللہ اللہ کر کے پہنچ گیا۔ بازار میں داخل ہوا دیکھا تو گنگ رہ گیا اتنا رش تھا جیسے پوری دنیا ایک جگہ اکٹھی ہوئی ہے ۔عورت ، بچے ، جوان کیا کہ بوڑھے حضرات بھی اپنے اپنے شوپینگ میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔اتنا شور تھا کہ دکان دار اور خریدار ایک دوسرے کی آواز نہیں سُن رہے اور اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے ایک دوجے سے سودے کی ڈھیل کر رہے تھے۔

ایک طرف بچے کھلونے اور پٹاخے لے رہے ہیں تو دوسری طرف عورتیں اپنی اپنی شاپنگ کر رہی ہے کبھی کیا اُٹھاتی ہے تو کبھی کیا کبھی کچھ پسند نہیں آتا تو کبھی جو پسند آجا※ تو دکان دار سے قیمت کم کرنے پہ جھگڑ رہی ہیں ایک آسمان سر پہ اُٹھایا ہوا ہے۔رہی بات مردوں کی تو وہ بھی کسی سے کم نہیں وہ بھی آجکل کے نوجوان اُف اللہ ! اللہ معاف کرے طرح طرح کے عجیب و غریب فیشن کیئے ہوئے یہ نوجوان کسی نے داڑھی میں ڈیزائن بنایا ہوا ہے تو کسی نے سر میں اور کسی نے عورتوں کی طرح رنگ برنگی سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔

اس کارن مرد اور عورت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ایک جمِ غفیر جمع ہوا ہے میں نے جیسے تیسے کر کے اپنے کام نپٹا لیے اور اب خوشی خوشی گھر کو روانہ ہوا۔ بڑی سخت گرمی تھی میں تھوڑا آگے چلا تو گرمی کی شدت زیادہ تھی اس لیے راستے سے ہٹ کر تھوڑی دور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ میں ادھر اُدھر نظر گمار رہا تھا لوگوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے ایک بابا جی سڑک کے ایک پار کھڑا دکھائی دیا۔

جس کی سفید داڑھی اور جھکی ہوئی قمر تھی لگ بھگ ساٹھ پھینسٹ برس کا تھا جو ٹھیک سے

چل پھر بھی نہیں سکتا تھا، وہ ہر کوئی جو راستے میں آتا اُسے روک کر کچھ باتیں کرتا پھر وہ بندہ چلا جاتا تھا اور بابا جی پھر وہی کھڑے دوسرے بندے کا انتظار کرتا تھا جب کوئی دوسرا آتا تو اُس سے بھی کچھ تکرار کر کے وہ بھی چلا جاتا حتا کہ میرے دیکھتے دیکھتے اُس نے چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔

مجھے یہ دیکھ کر تھوڑا اشتیاق ہوا کہ یہ کیا چل رہا ہے یہ بابا جی کیا کر رہا ہے کیوں لوگوں کو روک رہا ہے میں بابا جی کی طرف آگے بڑھا اور کہا! "بابا جی کیسے ہے آپ"؟

"ٹھیک ہوں بیٹا"

"بابا جی یہ کیا چل رہا ہے"؟

"کیا بیٹا"؟

"یہی بابا جی یہ آپ لوگوں کو روک کر کیا بتاتے ہے"؟

جب میں نے یہ سوال کیا تو بابا جی نظر جھکا کے کچھ دیر خاموش رہے میں نے پھر پوچھا۔

" بتاؤ؟ بابا جی"؟

یہ سُن کر بابا جی نے نظریں اُٹھائی۔ جیسے ہی اُس نے نظریں اُٹھائی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے وہ بولا! "بیٹا میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا"

"تو بابا جی یہ سب کیا ہے پر"؟

"بیٹا میرا بھی ایک تمہاری طرح بیٹا تھا جو چار مہینے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا اب میرا کوئی سہارا نہیں ایک ہی بیٹا تھا میرا، اب اُسکا ایک سات سال کا بیٹا یعنی میرا پوتا جو یتیم ہو گیا میں جیسے تیسے کر کے اُس کو پال رہا ہوں۔

لیکن آج اُس نے مجھ سے نئے کپڑے لانے کی فرمائش کی ہے میں اُس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میں تمہارے کے لیے نئے کپڑے ضرور لاؤنگا لیکن میں یہاں صبح سے کھڑا ہوں کہ

کوئی مجھے ایک کام دے تا کہ میں کچھ روپے کما کے اپنے پوتے کے لیے نیا سوٹ لے لوں۔ لیکن کوئی مجھے کام نہیں دے رہا کہ تم بوڑھے ہو تم کیا خاک کام کرو گے۔

اس لیے میں یہاں سے ہر آنے جانے والے سے یہی کہہ رہا ہوں کہ کوئی چھوٹا سا کام مجھے دے دیں لیکن کوئی مجھے کام نہیں دے رہا میں اُسے روٹی ٹھیک سے پیٹ بھر کے نہیں دے سکتا اور آج اُس نے پہلی بار سوٹ کی فرمائش کی ہے میں اُس یتیم کی اتنی سی خواہش بھی نہ پوری کروں تو میرے ہونے یا نہ ہونے سے اُسے کیا فائدہ"۔

یہ سب سُن کے میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور بابا جی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔

☆☆☆

اقوال زریں

☆کوئی کسی کی خاطر جتنے حربے آزمالے،تعویذ گنڈے کرلے،ڈاکٹروں سے دوائیں لے لے، چلے کاٹے، پھر بھی نتیجہ زیرو ہی ہے۔۔۔اس مرضِ بے وفائی کا کوئی علاج کہیں نہیں۔

☆کسی مشاعرے میں محفل سے داد وصول کرنے کے لیے شعر اچھا ہو نہ ہو۔۔۔آپ کی شکل اچھی ہونی چاہئے۔

☆مرد کے مقابلے میں عورت کو جلدی شہرت مل جاتی ہے۔

☆اچھا سیاستدان بننے کے لیے آپ کو جھوٹ بولنا اور دوسروں پر کیچڑ اُچھلنا آنا چاہیے۔

☆محبت کرنے کے بعد چین سے جینا چاہتے ہو تو جس سے محبت کرتے ہو اس پر اپنی محبت ظاہر مت کرو۔

☆ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی پرواہ کی جائے مگر وہ خود کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔

☆ہمہ وقت سچ کا راگ الاپنے والا،لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔

☆مجبوری آپ سے ہر وہ کام کروائے گی جس کا کرنا آپ کے شان کو زیب نہیں دیتا۔

ختم شد

مصنف سے رابطے کے ذرائع
Whatsapp No: 0331-5703912
Mobile No: 0349-48524850
Facebook : Anwar zeb Anwer
Instagram: Anwar zeb Anwer
Tiktok : anwarzebanwar213
Gmail:Anwarzebk258@gmail.com
Twitter: Anwar zeb Anwer
YouTube: انورزیب انور